محسوسات

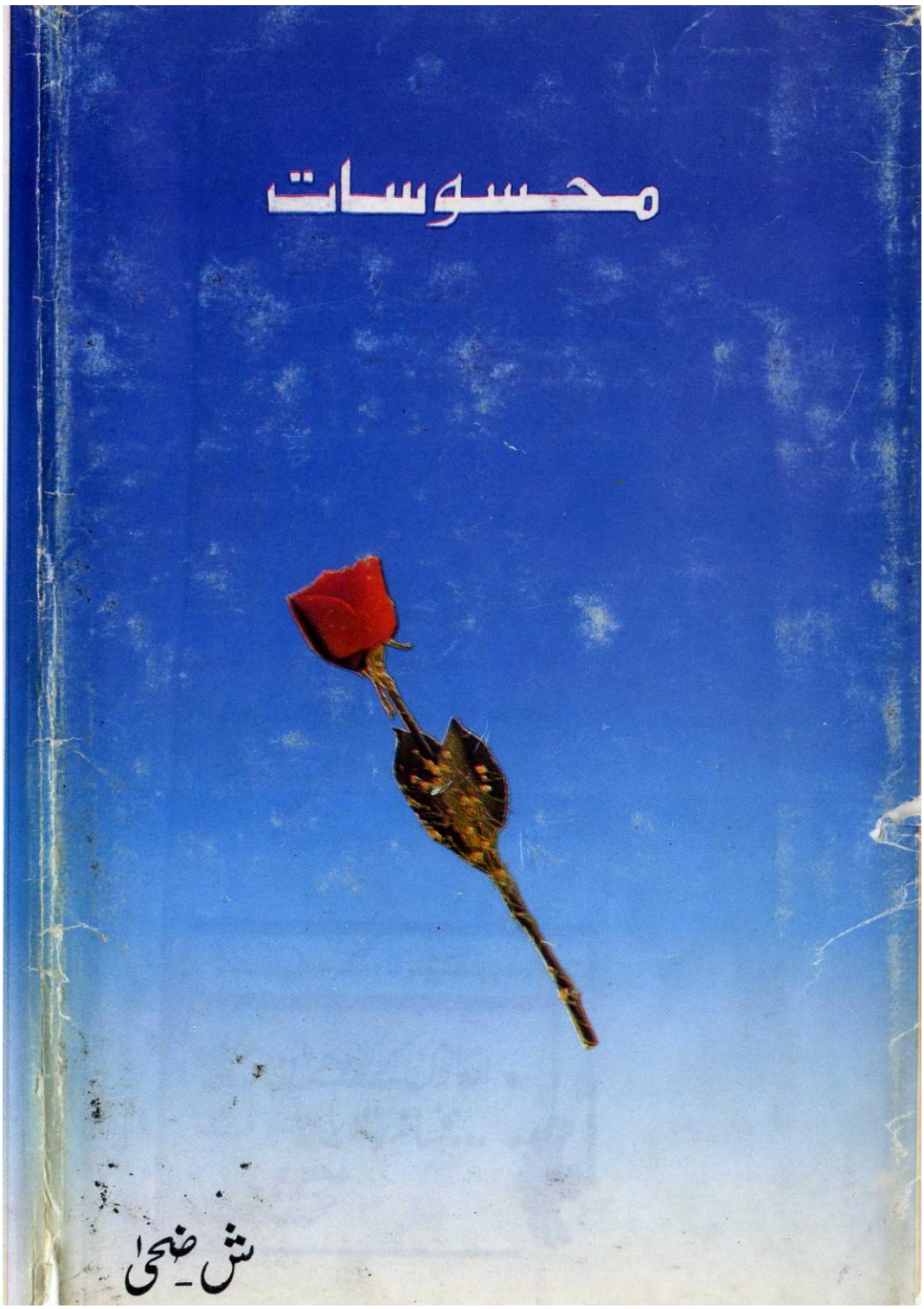

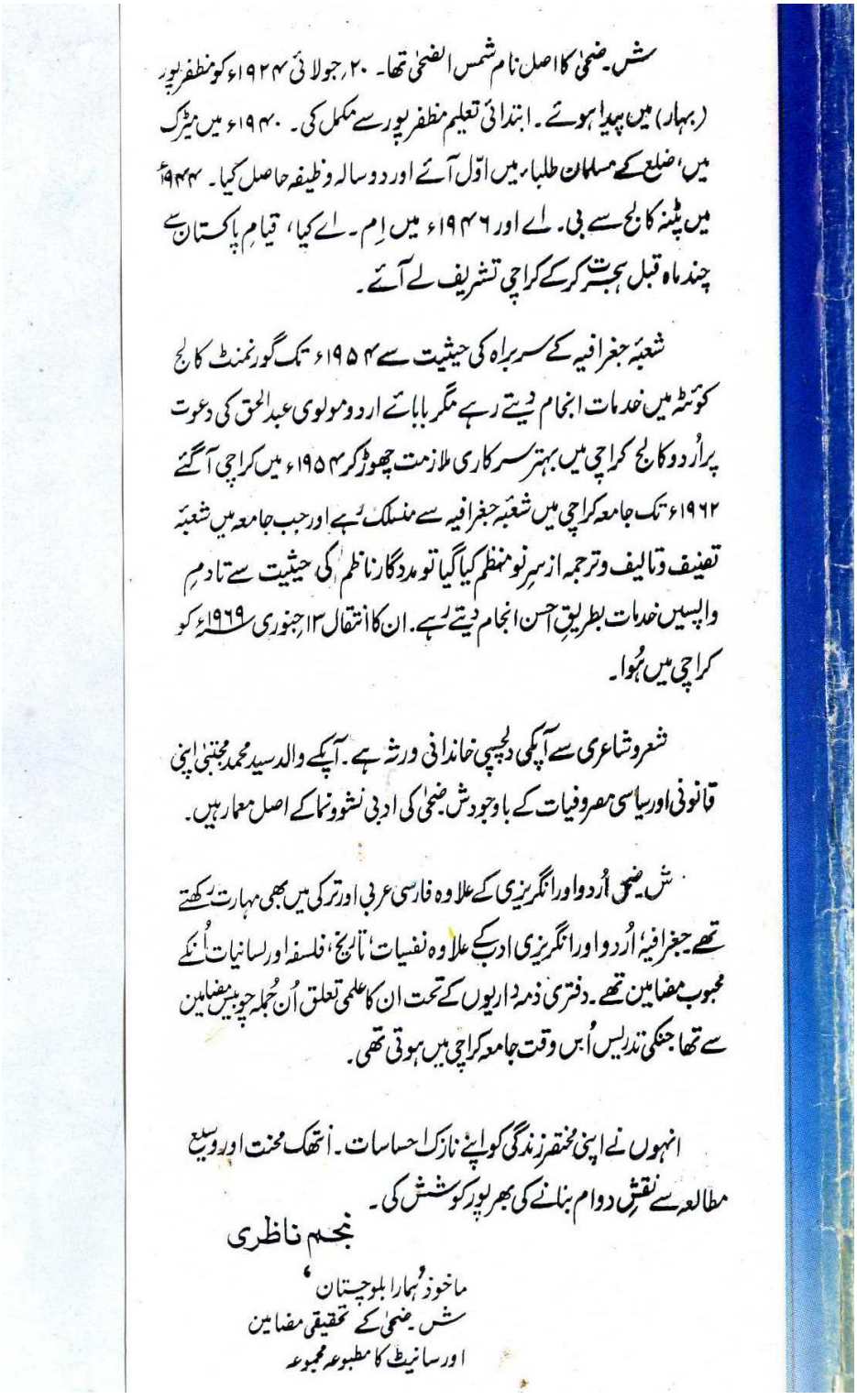

شش۔ضحیٰ کا اصل نام شمس الضحیٰ تھا۔ ۲۰ جولائی ۱۹۲۴ء کو مظفر پور (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مظفر پور سے مکمل کی۔ ۱۹۴۰ء میں میٹرک میں ضلع کے مسلمان طلبا میں اوّل آئے اور دو سالہ وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۴۴ء میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے اور ۱۹۴۶ء میں اِم۔ اے کیا، قیامِ پاکستان سے چند ماہ قبل ہجرت کر کے کراچی تشریف لے آئے۔

شعبۂ جغرافیہ کے سربراہ کی حیثیت سے ۱۹۵۴ء تک گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں خدمات انجام دیتے رہے مگر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دعوت پر اُردو کالج کراچی میں بہتر سرکاری ملازمت چھوڑ کر ۱۹۵۴ء میں کراچی آ گئے ۱۹۶۲ء تک جامعہ کراچی میں شعبۂ جغرافیہ سے منسلک رہے اور جب جامعہ میں شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ از سرِ نو منظم کیا گیا تو مددگار ناظم کی حیثیت سے تادمِ واپسیں خدمات بطریقِ احسن انجام دیتے رہے۔ ان کا انتقال ۱۳ جنوری ۱۹۶۹ء کو کراچی میں ہُوا۔

شعر و شاعری سے آپکی دلچسپی خاندانی ورثہ ہے۔ آپکے والد سید محمد مجتبیٰ اپنی قانونی اور سیاسی مصروفیات کے باوجود شش ضحیٰ کی ادبی نشو و نما کے اصل معمار ہیں۔

شش ضحیٰ اُردو اور انگریزی کے علاوہ فارسی عربی اور ترکی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جغرافیہ اُردو اور انگریزی ادب کے علاوہ نفسیات، تاریخ، فلسفہ اور لسانیات اُنکے محبوب مضامین تھے۔ دفتری ذمہ داریوں کے تحت ان کا علمی تعلق اُن جملہ چوبیس مضامین سے تھا جنکی تدریس اُس وقت جامعہ کراچی میں ہوتی تھی۔

انہوں نے اپنی مختصر زندگی کو اپنے نازک احساسات۔ انتھک محنت اور وسیع مطالعہ سے نقشِ دوام بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

نجم ناظری

ماخوذ: ہمارا بلوچستان
شش ضحیٰ کے تحقیقی مضامین
اور سائنیٹ کا مطبوعہ مجموعہ

جملہ حقوق بحق بیگم برلاس اعجاز اور
بیگم الماس رسول محفوظ ہیں۔

نام کتاب : محسوسات
تعداد : ایک ہزار
اہتمام : کلاسک ایڈورٹائزنگ، حسرت موہانی روڈ، کراچی
فون : ۲۱۳۵۷۹
ناشر : نصرت پبلیکیشنز۔ کراچی
قیمت : ۶۵ روپے
طابع : المنظر پرنٹنگ پریس
سرورق : کلاسک ایڈورٹائزنگ۔ کراچی
کتابت : سعید احمد
ملنے کا پتہ : نصرت پبلیکیشنز
اے۔ ۱/۲۷ بلاک ۴، گلشن اقبال، کراچی۔

ش۔ضحیٰ

اپنے ایک خط میں جس کی نوعیت بالکل نجی ہے ش۔ضحی نے اپنی شاعری کے متعلق بڑے عاجزانہ، منکسرانہ اور مخلصانہ انداز میں یہ کہا تھا میں کوئی بڑا شاعر کبھی نہیں تھا، ایک خاص دور میں، ایک خاص مقصد، جذبے اور تصور کے تحت لکھتا رہا۔ اب اگر کوئی بھولے بھٹکے ش۔ ضحی کو یاد کر لیتا ہے اور قومی نظموں خصوصاً میرے ساقی نامہ کا ذکر کر دیتا ہے تو بخدا میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ش۔ضحیٰ اپنے ایک نجی خط میں

سید ثروت ضحی نے لکھا

گستاخی معاف

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہر شام ہمارے گھر، کبھی برامدے میں تو کبھی ابا کے کمرے میں اُن کے کچھ مخصوص ادب دوست جمع تھے۔ شعروسخن کی محفلیں رات گئے تک جمی رہتی تھیں۔ اور سب ہی مخلص دوست ایک دوسرے کو داد دیتے رہتے تھے۔۔!!

میرے ذہن میں وہ مناظر اب بھی تروتازہ ہیں، جیسے کہ یہ کل ہی کی بات ہو۔۔!!
میں سوچتا تھا کہ کتنے اچھے ہیں یہ دوست۔!! اور اب سوچتا ہوں کہ کتنے عجب ہیں یہ دوست!!

ابا جان رخصت ہوگئے تو گویا وہ بھی شہر سے رخصت ہوگئے۔!! سچ کہا ہے کسی نے کہ ''مردہ پرستی'' کا کیا فائدہ؟ جو گذر گیا سو گذر گیا۔!! مگر اب شعور کے بعد یہ احساس ستانے لگا کہ نہیں۔!! مردہ پرستی جائز نہ سہی مگر کسی گذرے ہوئے کہ اچھے کاموں کو زندہ رکھنا چاہیے!!

اچھا تو یہ ہوتا کہ۔ یہ کام جو آج معمولی پیمانے پر میں نے کیا ہے وہ کوئی دوست کرتا۔!! وہ دوست جو ہر شام کی چائے ہمارے گھر پیتا، ایک ادبی فریضہ سمجھتے تھے، وہ دوست جو ابا سے یہ پیمان باندھتے رہے کہ آپ کی کتاب میں شائع کرواؤں گا۔! آپ کی کتاب کا مقدمہ میں لکھوں گا وغیرہ وغیرہ۔!! مگر اس بھیڑ میں نہ معلوم وہ کہاں کھو گئے ہیں۔!! شاید اُن کو اب فرصت نہیں ملتی ہوگی۔ یا پھر وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ'' ش۔ضحیٰ'' کو یاد کرنے سے بہتر ہے کہ کسی ایسے شخص کو یاد کیا جائے جو زندہ بھی ہو اور جاوید بھی۔۔ کیوں کہ زندہ وجاوید کا مطلب آج کل یہ ہی لیا جاتا ہے۔۔!!

اور ش۔ضحیٰ نہ زندہ ہیں اور نہ ہی اُن کا نام جاوید ہے!!

یہ کتاب ایک معمولی سا خراجِ عقیدت ہے جو ہم بیٹوں نے اپنے باپ کو دیا ہے، اُن کی شفقت، اُن کی محبت، ہمیں آج بھی یاد آتی ہے۔!! وہ حیات ہوتے تو ہم دل و جان سے اُن کی خدمت کرتے مگر۔۔!! خدا تعالیٰ کو شاید یہ منظور نہ تھا، وہ قادرِ مطلق شاید مصلحتاً ہمیں اس ثواب سے محروم رکھنا چاہتا تھا تو پھر اسکا گلا کیا۔۔۔!!

یہ ایک کوشش کی ہے، آج کے ناقدین اس پر انگلیاں اُٹھائیں یا اسے بیکار گردانیں۔۔۔!!
ہم نے بصد خلوص یہ قدم اُٹھایا ہے، دل پہ جو گذری ہے اس کا علم اسی کو ہوگا جو غیب کا حال جانتا ہے، خوشی اور غم دونوں کے مشترکہ احساسات ہیں۔

اک گذارش یہ ہوگی کہ وہ معزز دوست جو ہم سے گلا کرنے والے ہیں کہ ہم نے ان کو شریکِ خیال نہیں کیا، ہم نے اُن کی رائے نہیں لی، کلام کے انتخاب کے سلسلے میں تو۔۔
اس کا جواب کچھ اور سمجھ میں نہیں آتا سوائے اس کے کہ ش۔ضحیٰ کو سپردِ خاک کرنے کے بعد ہم نے یہ خیال بھی دل سے نکال دیا تھا کہ۔۔۔!! کوئی اور آ کر ہمارے آنسو پونچھے گا۔۔۔ ہم نے اب خود سیکھ لیا ہے کہ آنسوؤں کو کس طرح پونچھا جاتا ہے، کس طرح درد سہا جاتا ہے!!

یہ کتاب بھی اُسی درد اور اُنہی آنسوؤں کا مجموعہ ہے!! ش۔ضحیٰ نے جو درد محسوس کیا تھا، وہ اُن کا اک مشاہدہ تھا۔ انہیں کیا خبر کہ اُن کے بیٹوں کا یہ تجربہ ہے۔۔۔!!

یہ زیادتی ہوگی اگر میں محترم دوست جمال انجم کا شکریہ ادا نہ کروں کہ ان کی محنت کا یہ ثمر ہے، تمام تر مشکل مراحل پہ انہوں نے ہمارا ساتھ دیا اور اپنی بہترین تکنیکی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انہوں نے یہ خواب شرمندہ تعبیر کیا، انتخاب کلام کا مرحلہ میرے بڑے بھائی سید شوکت ضحیٰ نے انجام دیا، یہ اُن ہی کا حق تھا کیوں کہ ان کی رفاقت ابا جان سے مجھ سے سات سال زیادہ رہی ہے۔

میں تہہ دل سے مشکور ہوں اُن تمام معزز قلمکاروں کا جنہوں نے میری اس کوشش کو سراہا اور اپنے دوست کے بارے میں میری فرمائش پر اظہارِ خیال کیا۔!!

میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میرا شکوہ کسی خاص فرد، خاص گروپ یا خاص حلقہ سے نہیں ہے۔۔۔۔!! یہ صرف ش۔ضحیٰ کا مسئلہ ہی نہیں ہے، یہ مسئلہ ہر اُس آدمی کا ہے جو سچ بولتا، لکھتا اور سوچتا ہے۔ سچ کے عوض اس کو کیا ملتا ہے! یہ ہم اور آپ اچھی طرح دیکھ رہے ہیں۔

کاش۔۔۔آنے والے دنوں میں ہمارے آج کے بچے یہ سب اس طرح نہ دیکھیں۔

محسوسات

میں نے ہنستے ہوئے ہونٹوں کی خزاں دیکھی ہے
اشک آلود نگاہوں میں سکوں پایا ہے
سرنگوں دیکھی ہے کُہسار کی چوٹی اے دوست
میں نے صحراؤں میں بے نام فسُوں پایا ہے

سیل میں ساحلِ آرام بھی دیکھا ہے ، ندیم
ساحلوں پر بھی نظر آے ہیں اکثر گرداب
میں نے دیکھا ہے کئی بار چمن زاروں میں
پھول کی آگ میں جلتے ہوئے کانٹوں کا شباب

تجھ سے کہتا ہوں مگر تجھ کو نہ آئے گا یقیں
برف کی گود میں شعلے بھی مچل سکتے ہیں
رات کے خوف سے سورج بھی لرز سکتا ہے
آگ کے قلب سے چشمے بھی اُبل سکتے ہیں!!

(ماہِ نو) کراچی ۱۹۴۷

قیدی

یہ کون پکارتا ہے مجھ کو
آفاق کے سرمگیں خلا سے؟
ہے مجھ کو گلا یہی خدا سے
پابندِ خلائے زندگی ہوں
جاؤں بھی تو پاس کیسے جاؤں!!

(کراچی ۱۹۴۷)

مِری خطا بھی نہیں !

دلِ حزیں نے تمہیں آج پھر پکارا ہے !
تصوّرات نے تم کو سلام بھیجا ہے !

بہت حقیر سہی ، پر قبول کرلینا!
کہ یہ سلام بہاروں کی اک امانت ہے
نصیب ہو نہ سکی جن کو خلعتِ الفاظ
اُنہیں خموش اشاروں کی اک امانت ہے !

کہ یہ سلام امانت ہے اُن ستاروں کی
جو نا مراد رہے ، کامیاب بن نہ سکے!
تمام رات کی تابندگی کے دکھ سہہ کر
فلک سے ٹوٹ گئے ، آفتاب بن نہ سکے!!

کسے خبر کہ یہ میرا سلامِ آخر ہو!
کسے خبر کہ یہ میرا پیامِ آخر ہو!

جو سُن سکو ، تو ذرا سُن کے مسکرا دینا،
کہ اب فضاؤں میں پہلا سا دُھند لکا بھی نہیں!
اُبھر رہے ہیں فلک پر نئے نئے سے نجوم،
مری بہارِ گزشتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مری خطا بھی نہیں!

یہ زندگی ہے ، تقاضوں کی اک قیامت ہے
سمجھ سکو تو یہ پہلو بھی حسُنِ فطرت ہے

علامہ اقبال کی خدمت میں

میں تری یاد میں گلہائے عقیدت کے عوض
مئے خوناب سے لبریز سبُو لایا ہوں!
''بالِ جبریل'' کی سوگند تجھے ، دیکھ تو لے
تیرے جاں باز شہیدوں کا لہو لایا ہوں!

یہ اُن ہی کا ہے لہو جو تھے غلام ابنِ غلام،
جن کی گفتار میں شوخی تھی نہ کردار میں آگ!
آج اونچا ہے ہمالہ سے بھی پرچم جن کا
جن کی ہر بات میں للکار ہے ، تلوار میں آگ

تُو نے تاریخ کی زلفوں میں کیا تھا شانہ
ہم نے صندل کے عوض خونِ جگر گھول دیا
تیری آواز کی تاثیر تھی یا ضربِ کلیم،
ہند میں شوکتِ اسلام کا در کھول دیا

قرطبہ جا کے لُٹائے تھے جو آنسو تُو نے
مہر و مہہ بن کے کراچی میں درخشاں ہیں آج!
فرطِ غم یہ ہے کہ مژدہ یہ سُنائیں کس کو
سورِ بے مایہ نہیں، ہم تو سلیماں ہیں آج!

کھول دے روزنِ فردوس ، خودی کے صدقے،
اپنے دیرینہ نشیمن کی بہاروں کو تو دیکھ
دیکھ، کشمیر کی وادی میں تبسم اپنا
سر بکف مردِ مجاہد کی قطاروں کو تو دیکھ!!

(ماہِ نو ، نوائے پاک) (کوئٹہ ۱۹۴۸)

سراب

رات کے بیکراں اندھیرے میں،
کون ہے یہ جو مسکرا اُٹھا!؟
شربتی آنکھ ، لانبے لانبے بال!
سَرو سا قد، گلاب سا چہرہ!!

آؤ، آجاؤ بھی ، مگر تم کو
یہ اندھیرا پسند آئے گا؟؟
لو ، جلا دو یہ شمعِ امید،
کچھ تو ماحول خوف کھائے گا!!

کیا کہا؟۔۔ یونہی آگئی تھیں تُم!؟
جارہی ہو،!۔ مگر سنو تو بات،
مسکرانے کی کیا ضرورت تھی!؟
کٹ ہی جاتی مری اندھیری رات!!

(کراچی ۱۹۴۸)

دوزخ!

ایک لحظہ کے لئے میری نگاہیں جو اُٹھیں،
میں نے دیکھا کہ وہ آنکھیں ، وہ نشیلی آنکھیں
جن کو امرت کے کٹوروں سے کیا تھا تعبیر،
اُن میں اک بوند بھی امرت کی نہیں آج کی رات!

اور پھر آج کی اس رات پہ موقوف ہے کیا،
اِس طرف میں نے کئی رات یہی دیکھا ہے
ایک شعلہ ہے کہ بھڑ کا ہی چلا جاتا ہے!!

کیا خبر تھی کہ یہ آنکھیں نہیں، ہیں آگ کی جھیل
جن میں رہ رہ کے بھڑک اُٹھیں گے لاکھوں طوفاں
مر کے دوزخ میں جو جلتے ہیں اُنہیں کیا معلوم
تیری آنکھوں میں بھی دوزخ کی لپک ہے پنہاں،
جو مری روح کو سوکھے ہوئے پتّے کی طرح
اپنے پنجے میں جکڑ لے گی، جلا ڈالے گی!!

میں ہی اندھا تھا جو کشکولِ محبت لے کر
آستانہ پہ ترے آکے صدائیں دی تھیں!
یہ صدا جسم کی آواز نہیں تھی ، لیکن
تُو نے سمجھا کہ اسے روح سے کچھ ربط نہیں!
اپنی ہم جنس زلیخاؤں کی صورت آخر
تجھ کو بھی جسم کی لذت کا خیال آہی گیا!
اپنی اک عام حقیقت کا خیال آہی گیا!

جسم تیرا، تیرے ارمانوں کی جنت ہی سہی!
ایک دن تیری یہ جنت بھی تو بِک جائے گی!!

پھر وہ دن آئے گا جب فرض کے انگاروں پر
جل اُٹھے گا تری نازک بَدَنی کا یہ چمن
اور سو جائے گا تھک تھک کے ترے جسم کا راگ
تب کہیں جاکے تری روح میں کچھ ہوگی چبھن!
میری بخشی ہوئی جنت تجھے یاد آئے گی!
اپنی کھوئی ہوئی دولت تجھے یاد آئے گی!

(کراچی ۱۹۴۸)

کوئٹہ کے حسین نظّارے

دور پچھّم میں ڈوبتا سورج،
سرِ کُہسار کچھ شفق پارے!
سبز وادی میں کچھ شگفتہ گلاب،
جیسے مخمل پہ سُرخ انگارے!
بادِ صر صر کے اک اشارے پر،
آنکھیں مَلتے ہوئے اُٹھے تارے!
نغمہ و نُور کی ہوئی بارش،
مستیوں کے اُبل پڑے دھارے!

کتنے رنگیں،۔۔۔ مگر اُداس اُداس!!
کوئٹہ کے حسین نظّارے!!

(کوئٹہ ۱۹۴۸)

آخری بار۔۔۔

اک ذرا بند قبا کا لگالوں تو چلوں!
عطر میں پیرہن ِ نو کو بسالوں تو چلوں!
اپنی سج دھج کو ذرا اور بڑھالوں تو چلوں!
خودکو ہر گوشے سے اے دوست! سجالوں تو چلوں!

ہے یہی ریت زمانے کی یہی اس کا چلن
لب پہ ہے ایک تبسم تو ہے دل میں الجھن!
دیکھنا! وہ اُبھر آئی ہے کہیں ایک شکن!
اس شکن کو جو سلیقے سے چھپالوں تو چلوں!

ظلمتیں لوٹ گئی ہیں مِرے کاشانے سے!
شش جہت میں ہے تبسم مِرے افسانے سے!
نکہتیں آئی ہیں ماضی کے چمن خانے سے
نکہتوں کا جو یہ احسان اُٹھالوں تو چلوں!

آج مضراب ہے اور ساز کا ٹوٹا ہوا تار!
سہمی سہمی سی مسّرت ہے، پریشاں افکار!
کر سکوں گا نہ بھری بزم میں اُن سے انکار!
ساز کے ٹوٹے ہوئے تار سجالوں تو چلوں!

چشمِ بےخواب میں جلتے ہوئے اشکوں کے دیئے!
اپنی بانہوں میں لئے میری وفا کے لاشے،
کون آتا ہے سسکتا ہوا؟ آنے دو اسے!
آخری بار اسے پاس بُلالوں تو چلوں!!

اندھیرے عرش پر!!

جبیں پہ تیری شکن ہے ، نظر میں غصہ ہے!!

مرا قصور یہی تھا کہ اپنے کچھ افکار،
دل و جگر کے لہو میں رنگے ہوئے اشعار،
جنہیں کہ تیرے ہی غم نے بنادیا شہکار،
چُھپا سکا نہ اُنہیں اپنے ایک ہمدم سے!
رفیقِ غم تھا، مرا درد، دُکھ سمجھتا تھا،
گھٹا کو دیکھ کے وہ برق تک پہنچتا تھا
ہزار بار مرے اشکِ غم کے پردے سے
جو تاک جھانک کے پہچان بھی گیا تھا تجھے
پُکار سُن کے پڑی چوٹ جس کی رگ رگ پر
تڑپ اُٹھا، کہ یہ آفاق گیر ارماں ہے
چُھپا کے اس کو نہ رکھو، یہ سوز ساماں ہے!!
مری نگار! یہ سوچا کہ مان بھی جاؤں
پہنچ سکا نہ لہو جب ترے ہی دامن تک

تو کیا بُرا ہے اگر ''گرد و پیش'' کا دامن
سنبھال لے مری بے کش بہارِ خونیں کو!
مگر سماج کے ڈر سے یہ کہہ دیا تُو نے

' یہ میرے دامنِ دوشیزگی پہ دَھبہ ہے ! '
جبیں پہ تیری شکن ہے، نظر میں غصّہ ہے!

سماج تو یہی چاہے گا ، اے مِری محبوب!
زمیں بھی، عرش بھی ڈوبے رہیں اندھیرے میں
کہیں بھی شمعِ محبت جلا سکے نہ کوئی!
نہ میں، نہ تُو، نہ کوئی اور اس زمانے میں
سمجھ سکے کہ محبت بھی اک حقیقت ہے!
سماج تو یہی چاہے گا ، اے مِری محبوب!
خدا کرے کہ ترے کان میں بھی پڑ جائے
کئی ہزار صدی کی یہ چیختی آواز۔۔
۔۔'جلاؤ ! ایک بھی ننھی کرن' جلاؤ بھی!' ۔۔

مری نگار! یہ آنسو مجھے بہانے دے!
اندھیرے عرش پہ اک شمع تو جلانے دے!!
جَلا سکا نہ کرن کوئی گر تو سوچ ذرا
کئی ہزار صدی کو جواب کیا دوں گا!؟

''گردوپیش'' (کراچی ۱۹۴۹)

نیا ماضی!!

رات کی تیرہ و خوابیدہ فضا میں، محبوب!
وقت کی چشمِ المناک سے اِک گوہرِ اشک
گِر پڑا !! ---------- ٹوٹ گیا!!

اور یہ میں نے دیکھا

لبِ دوشیزۂ فطرت کے تبسم کی ضیا
بامِ مشرق پہ ذرا اور چمک اُٹھی ہے
نئے مولود کو آغوش میں لینے کے لئے
خلوتِ گُل سے نکل آئی ہے بے تابانہ
لیلیٰ بادِ صبا!!
نئے مولود کو آغوش میں لینے کے لئے

جب چلی بادِ صبا

نیم غنچوں نے بھی پھیلا دیا اپنا دامن
کونپلوں نے بھی لچکتے ہوئے چپکے سے کہا
صبحِ نو! صَلِّی عَلیٰ!!

میرے محبوب! مرے دل نے کیا یہ محسوس
اب تو آفاق میں نغمے ہی رہیں گے ہر دم!
یعنی دوشیزۂ فطرت ہی کو رقص آیا ہے
تب تو پائل کے چھناکے ہی رہیں گے ہر دم!!
میں نے سوچا کہ نئی صبح، نیا سال آیا ہے
لال ڈورے لئے آنکھوں میں ترے پاس آؤں
اور تجھ سے یہ کہوں
'اب ذرا ساز اُٹھا!!'
ناگہاں دور سے کانوں میں یہ آواز آئی
پھر نئی صبح ، نئے سال کی اس آمد کو
تُو نے ندرت گہہ فردا کا پیامی سمجھا!
میرے معصوم! حسیں خوابوں کی تخلیق نہ کر
سالِ نو پر تو نہ جا!
یہ تو ماضی ہے جو ہر بار پلٹ آتا ہے!!

(کراچی ۱۹۴۹)

قرآن کی صبح!

شبنمیں رات کے تاروں کی تنک ضو قندیل
آج کچھ وقت سے پہلے ہی بجھی جاتی ہے!
مہرِ زرپاش کی کرنوں کا بجاتی ہوئی ساز
جھومتی جھامتی اک صبح چلی آتی ہے!

یہ تو وہ صبح نہیں ہے کہ بہ عنوانِ دگر
سازِ فطرت کا جسے نغمۂ شیریں کہہ لیں!
یہ تو وہ صبح نہیں ہے کہ بہ عنوانِ دگر
شاہدِ وقت کا اک جلوۂ سیمیں کہہ لیں!

یہ نئی صبح محمدؐ سے ہے پیمان کی صبح!!
یہ تو اسلاف کی آواز ہے، قرآن کی صبح!!

(گردوپیش) (کراچی، اگست ۱۹۴۸)

پس منظر

یہ لٹن روڈ، یہ سر سبز چناروں کی قطار!
جیسے دو رویہ صف آراہوں عروسانِ بہار!
دُور ، چلتن سے پرے ، ڈوب رہا ہے سورج
تیرتی پھرتی ہے وادی میں سنہری جھنکار!
تازہ پھولوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں سے
فرش گُلکار اِدھر، عرش اُدھر ہے گُلکار
پھول تو پھول ہیں ،کانٹے بھی ہیں رنگیں، اے دوست
سنگ ریزوں میں مچل اُٹھتی ہے، موجِ انوار!

یہ تو منظر ہے مگر اے مرے ہمدم، مرے دوست!
تُو نے پامالیء فطرت کو بھی دیکھا ہوتا!
میں تو جب کہتا کہ ہاں! موسمِ گُل آیا ہے
جب پہاڑوں پہ بھی اس بات کا چرچا ہوتا!
جب چٹانوں کا جگر توڑ کے بہتا پانی،
آبشاروں کا لہکتا ہوا نغمہ ہوتا!

"میوہ بازار" کی سڑکوں پہ وہ سونے والا
میوہ بازار کی گھنی جھاؤں میں سویا ہوتا!

اِن چناروں کے حسیں سائے میں اکثر مجھ کو
ایک کُملایا ہوا پھول نظر آیا ہے
پھول! تخلیق کا شہکار! وہ بنتِ کہسار،
جس کے جذبات کو قانون نے ٹھکرایا ہے
وہ بہاروں میں بھی پامال ہی رہنے والی،
وادی شال کی رعنائی کا سرمایہ ہے!
کتنے ہی پھول نگاہوں سے نہاں ہیں ایسے
جن پہ ایجادِ زمانہ نے ستم ڈھایا ہے!

یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ چناروں کی قطار!
جیسے دو رویہ صف آراہوں عروسانِ بہار
یہ تو منظر ہے مگر دیکھ! کہ پس منظر میں
جیسے شرمندہ ہے اس موسمِ گُل کا فنکار!!

(کوئٹہ ۱۹۴۹)

علامہ اقبال کے حضور

زمیں سے دور ، خدا کی حسین جنت میں
کنارِ کوثر و تسنیم جھومنے والے!
ترے حضور بہ صد احترام لایا ہوں
وہ چند اشک جو آنکھوں میں بن گئے چھالے

خطامعاف! کہ تجھ سے مجھے بھی ہے اُلفت
ترے کلام نے مجھ کو بھی زندگی دی ہے
مرے حبیب! مرے شاعرِ حیات! مگر
ابھی حیات کفن در کفن سسکتی ہے

ترے غریب ابھی تک ہیں خواب آلودہ
کہ خواب سے اُنہیں ہم بھی جگا نہیں سکتے
فلک نُما ہیں امیروں کے کاخِ رنگارنگ
ہم ایک اینٹ بھی اس کی ہِلا نہیں سکتے

ابھی تو نقشِ کہن کی حفاظتوں کے لئے
بنائی جاتی ہے ہر روز اِک نئی تلوار
تراشا جاتا ہے ہر روز اِک نیا حیلہ
بہت لطیف، بہت خوشنما، بہت بیکار!

اُفق سے لے کر اُفق تک خلا کے سینے میں
جو درد ہے اُسے کوئی چھپا نہیں سکتا!
مگر تجھے یہ بتادوں کہ اِن غریبوں کو
تھپک تھپک کے یہ حیلہ سُلا نہیں سکتا!

وہ بد نصیب، وہ دہقانِ فاقہ کش جس نے
ہر ایک دانہ گندم کو کر دیا گوہر
وہ اک عجیب تبسّم کے ساتھ جاگے گا
بڑھے گا ہاتھ میں مشعل لئے بہ عزمِ دگر

ترے کلام کی تکمیل کر کے چھوڑے گا!
ترے پیام کی تکمیل کر کے چھوڑے گا!

(کوئٹہ ۱۹۴۹) 'امروز' لاہور

کہنہ فسوں

زمین و عرش کے خالق ، مرے خدائے جلیل!
تجھے یہ تیرا گُہستاں سلام کہتا ہے
سلام کہتے ہیں ''کرتھار'' و ''چلتن'' و ''مُردار''
یہ اوجِ ''تختِ سلیماں'' سلام کہتا ہے
یہ تیری کار گہِ فن ، تیرا بلوچستان،
ترا یہ خوابِ پریشاں سلام کہتا ہے
سلام کہتی ہے تجھ کو یہ ''شال'' کی وادی
یہ تیرے جبر و مشیت کی جلوہ گاہِ ملول!
یہ سنگلاخ چٹانیں، یہ نامُراد زمین
جہاں نہ سبزہ، نہ دریا ، نہ آبشار، نہ پھول!
زمین و عرش کے خالق ، مرے خدائے جلیل!
سلام کہتا ہے تجھ کو ترا یہ کہنہ فسوں!
سلام کہتا انگور کا یہ ٹھنڈا رس،
یہ تیرے فاقہ کشوں کے جگر کا میٹھا خوں!!

''بولان'' گورنمنٹ کالج، کوئٹہ (کوئٹہ ۱۹۴۹)

اگست کا یہ مہینہ ، یہ پندرہ تاریخ

اگست کا یہ مہینہ ، یہ پندرہ تاریخ

یہ شاہراہوں پہ بکھرے ہوئے خوشی کے پھول
یہ طفل و پیر و جواں،یہ ہجوم رنگا رنگ
یہ قمقموں کے گلستاں،یہ روشنی کے پھول
یہ آنچلوں کی بہار،یہ عارضوں کے گلاب!
کہیں شباب ،کہیں صرف کمسنی کے پھول!
یہ نرم نرم ہوائیں ، یہ دلربا لمحات
کِھلے کِھلے سے یہ ہر سمت زندگی کے پھول!

یہ پھول لاکھ شگفتہ سہی مگر اے دوست!

کچھ ایسے پھول ہیں جن کوابھی کِھلنا ہے
ابھی تو صحنِ چمن میں ہیں جا بہ جا کانٹے
بچا بچا کے گریباں اِنہیں ہٹانا ہے
رَوِش رَوِش پہ چھڑکنا ہے تم کو خونِ جگر
ہر ایک برگِ چمن کو چمن بنانا ہے
یہ نور و نغمہ ، یہ رقصِ عروسِ آزادی
تمہارے وجدِ عمل کے لئے بہانہ ہے

بڑھے چلو ، کہ بلاتی ہے کہکشاں تم کو

تمہارے جادے پہ ہے سجدہ ریز عرشِ بریں
پکارتی ہے تمہیں عصرِ نو کی تاریکی،
بھٹک رہی ہے تمہارے فراق میں یہ زمیں
تمہارے جوش میں مضمر ہے جوش ہستی کا
تمہارے دوش پہ دنیا ،تمہارے دوش پہ دیں!!
اگست کا یہ مہینہ ، یہ پندرہ تاریخ،
تمہاری ایک جھلک کے سوا کچھ اور نہیں!

تمہیں تو رُخ سے مگر یہ نقاب اُٹھانا ہے!
بڑھے چلو ،کہ تمہارا ہی اب زمانہ ہے!

''ماہ نو'' (کوئٹہ ۱۹۴۹)

میری انیسِ زندگی!

میری انیسِ زندگی!
میری ہنسی، میری خوشی!
میرے سکوں کی پاسباں،
دنیا میرے قرار کی!
میری انیسِ زندگی!

میرا اُفق، مِری فضا!
میری شفق، مِری گھٹا!
میرا چمن، مِری روش!
میری بہار خوش ادا!
میری صبا، مِری کلی!
میری انیسِ زندگی!

نغمہ و نور و رنگ و بو!
منزلِ شوق و جستجو!
تجھ کو بس اور کیا کہوں
ساقی پارسا ہے تُو
میکدہ مجاز کی!
میری انیسِ زندگی!

مصلحت !!

خلا کی سرد وسعتوں پہ خندہ زن ہے دُھندلکا!
ہوائیں سوگوار ہیں!
فضاؤں میں رچی ہوئی ہے آج یوں فسردگی
کہ جیسے زندگی کبھی ہماری زندگی نہ تھی!
خموشیوں میں سسکیوں کا ڈنک ہے چبھا ہوا!!

یہ دُھندلکا، یہ خامُشی،
فسردگی، یہ سسکیاں،
یہی ہے میری اس عظیم کائناتِ نو کی داستاں!!
خزاں ہو، یا بہار ہو،
کلی ہو، خار ہو کہ سنگ و خشت کا مزار ہو،
یہی ہے میری اس عظیم زندگی کا مدعا
کہ ایک خوش نما فریبِ زندگی لئے ہوئے
مِرا قلم رُکا رہے!
زباں سے کچھ نہ کہہ سکوں،
حیات کی حماقتوں کو مصلحت کے آئینے میں دیکھتا رہوں!!

(کوئٹہ ۱۹۴۹)

پندرہ اگست

مِرے دل رُبا دلنشیں ساقیا!
مئے ارغوانی کی بوتل اُٹھا!
اُٹھا اور فضا میں لُنڈھا دے اسے
جدھر جی میں آئے بہا دے اسے!
کہ عالم ہے خود آج جامِ شراب،
مِرا ہر نفس بن گیا ہے شباب
رگ و پے میں غلطاں ہیں شمس و قمر!
تجلّی فزا ہے مِری ہر نظر!
مِرا ہر قدم ہے چمن آفریں!
گل و لالہ و نسترن آفریں!
مِرے نقشِ پا پر ثریا نثار،
بلائیں مری لے رہی ہے بہار!

وطن آج مرا ہے سر شار ومست
کہ ہے پندرہ اور ماہِ اگست

ہمالہ سے بحرِ عرب تک ہے نور!
فضا نیلی نیلی ،ہوا میں سرور!
چناب اور جہلم مچلنے لگے،
مچل کر ہر اک سُو اُبلنے لگے!
نئی دُھن میں کچھ گنگناتا ہوا!
ہمارا فسانہ سُناتا ہوا!
بناتا ہوا اِک نئی رہ گذر،
ہے دریائے مہران بھی جوش پر!
وہ پنجاب کا مخملیں مرغزار،
ہُوا اک نئی آن سے نغمہ بار
وہ سرحد کے غازی جواں جاگ اُٹھے
وہ خیبر کے ذرّے مچلنے لگے!
وہ بولان کا دل دھڑکنے لگا!
چٹانوں سے پانی اُبلنے لگا!
ہے صحرائے سندھ اِک چمن درکنار
بگولوں میں رقصاں ہیں پھولوں کے ہار!
فسوں ساز وہ دیس بنگال کا،

زمرّد کا ٹکڑا تراشا ہوا!
نظرتاب ہے جس کے کھیتوں کا رنگ!
کوئی جاکے دیکھے تو اُس کی اُمنگ
فضاؤں میں کھا کھا کے سَو پیچ و خم
جھماجھم برستا ہے ابرِ کرم!
ندی اور نالوں میں برپا ہے شور
نئی زندگی ہے، نیا اِس کا زور!

زمیں بھی نئی،آسماں بھی نیا!
نئی منزلیں،کارواں بھی نیا!
نئی موجِ صر صر، نیا گلستاں،
نئے ہم،ہماری نئی داستاں!

یقیں گر نہ آئے کراچی کو دیکھ
کراچی کی عشوہ طرازی کو دیکھ
یہ گمنام قطرے سے گوہر بنا
بس اِک حرف تھا،بڑھ کے دفتر بنا

کراچی یہ میرا گُلِ نَو بہار!
دمشق اور بغداد کی یادگار!
مِرے قرطبہ کے جگر کا لہُو!
کرچی سے دِلّی کی ہے آبرو!
بنایا اسے ہم نے جب تخت گاہ
نکل آئی تاریخ کی شاہراہ!
سیاست کے گیسو سنورنے لگے
ہر اِک سمت موتی بکھرنے لگے!
صدا آئی، مشرق کے اے لاڈلو!
حجاباتِ فطرت اُٹھاتے رہو،
کرچی کے جلوے سلامت رہیں!
فضا میں یہاں ماہ پارے ڈھلیں!

یہاں آفتابوں کی تشکیل ہو!
ادھورے فسانوں کی تکمیل ہو!

بنامِ محمدؐ، بنامِ علیؓ
مجھے اپنے قائد کی یاد آگئی!
وہ قائدؒ،وہ اسلام کا رازدار!
وہ ملّت کے میدان کا شہسوار

وہ مِرا مجاہد، مِرا راہبر!
کیا جس نے میری شبوں کو سَحر
نگاہوں میں جس کی یہ تاثیر تھی
غلامی کی زنجیر بھی کٹ گئی!
کبھی جس کی تقریر خارا شکن!
کبھی صرف پھولوں کا رنگیں چمن!
شجاعت کا پیکر، صداقت کا جام
وہ نازک بدن اور نازک خرام!
مگر اللہ! اللہ ! اُس کا وقار
جدھر چل پڑا جُھک گئے کوہسار!
ٹھہر سا گیا دو گھڑی بھی جہاں
وہیں رُک گئی گردشِ آسماں!

مجھے جس نے بخشا ہے یہ تخت و تاج
کہاں ہے وہ میرا جہاں دار آج؟؟
نہیں! وہ نگاہوں سے پنہاں نہیں!
نظرآج بھی میری ویراں نہیں!

وہ قائدؒ جو فردوس میں شاد ہے
وطن کی فضاؤں میں آباد ہے!
مرے روز و شب کے تبسّم میں ہے
وہ بحرِ عرب کے طلاطم میں ہے
منوڑا کے مینارۂ نور پر،
اُسی کا ہے عکسِ جبیں جلوہ گر!
کرن بن کے سورج کی رخشندہ ہے
ہمارے ارادوں میں وہ زندہ ہے
اُٹھا اب یہ پاکیزہ پرچم، اُٹھا!
یہ قائد کا دامن ہے، اے ساقیا!
چلا چل ذرا مسکراتا ہوا
خُدائی کے جوہر دکھاتا ہوا
"جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود!
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخی فکر و کردار کا"
وہ قائدؒ ترا اب بھی دمساز ہے!
یہ ماہِ اگست اُس کی آواز ہے!

نوائے پاک
نشیدِ حریت ماہِ نو کوئٹہ ۱۹۵۰ء

گیارہ ستمبر

وہ ایک رات کہ میں بے سبب پریشاں تھا!

وہی زمیں تھی ، وہی آسماں تھا ہر سُو
وہی فضائے وطن تھی نثار جس پہ شراب!
وہی تھی بزمِ تمنا، وہی کراچی تھا
وہی تھے سُنبل و ریحان و یاسمین و گلاب!
کنارِ بحرِ عرب تھی وہی شریر نسیم!
وہی شمیمِ چمن تھی، وہی چمن کا شباب!
سکوتِ نیم شبی تھا وہی کہ جس نے مجھے
ہر رات سنایا تھا نغمہ پُر خواب!
مگر عجیب سی یہ بات تھی کہ میری نظر
خلا میں دیکھ رہی تھی ہر اک طرف گرداب!

اُبھر اُبھر کے ستارے فلک سے ڈوب گئے!

فلک سے دُور، سحر کی جھلک نظر آئی!
قبا دریدہ، جبیں پر لہُو کی دھار لئے
سسک کے اُفق پر عیاں ہوا سورج

گناہِ وقت کا کاندھوں پہ اپنے بار لئے!
فضائیں چیخ پڑیں،شور ہو گیا برپا،
زمیں جاگ اُٹھی ، قلبِ داغدار لئے!
فلک سے آئی صدا ، اے دیارِ پاکستاں!
تری بہار ہے فردوس در کنار لئے
مگر یہ عرش کا فردوس اور اُس کی بہار
ہے آج تیری طرف چشمِ انتظار لئے!

وہ جاں نثارِ حرم ، یعنی قائدِاعظمؒ

نظر جھکائے ہوئے، جسم کو چُرائے ہوئے
حصارِ قصر سے نکلے صد احتشام کے ساتھ
شبِ بہار میں گویا فلک کے گوشے سے،
سفید ابر سا اُبھرا مہہ تمام کے ساتھ!
چمن سے جیسے نسیمِ چمن نکل آئی!
سکوتِ ناز و دلآویزیٔ خرام کے ساتھ!
وہ اپنی منزلِ فردوس کی طرف جو چلے
زمانہ دوڑ پڑا ، آہِ ناتمام لئے!

عجم نے رکھ دی کلیجے کی قاش قدموں پر
عرب نے اشک نچھاور کئے سلام کے ساتھ!

شکستِ ساز نے نغموں کو کردیا جاوید!

سبُو جو ٹوٹ گیا ، فرشِ میکدہ کی قسم،
خُمار بن کے نظر میں سبُو رہا موجود!
مرے حبیب! مرے تاجدارِ گوشہ نشیں!
ترے عدم میں بھی پنہاں ہے ایک شانِ وجود
ترے لحد کی اسی خاکِ عطر آگیں سے
بہارِ گلشنِ فردا کی ہورہی ہے نمود!
یہ خواب گاہ تری،درس گاہِ عرفاں ہے
ہے عصرِ نو کے مسافرکی منزلِ مقصود!
ترے پیام کی تعمیل،عشق کی تجدید!
یہی ہے اپنی دعا ، اور یہی رکوع و سجود!

خدا گواہ کہ اب بھی ہے تُو امیر اپنا
تری قسم کہ ہے یہ شش جہت اسیر اپنا

''ماہِ نو'' دسمبر ۱۹۵۰ء (کوئٹہ ۱۹۵۰ء)

جنت نشاں بنائیں گے!

یہ عرضِ پاک ، یہ گیتی سلام کہتی ہے
ہر ایک چیز یہاں کی سلام کہتی ہے
سلام کہتی ہے تجھ کو فضا زیارت کی
تجھے یہ شآل کی وادی سلام کہتی ہے
بہار کی یہ اُداسی ، چنار کا یہ سکوت
یہ برگ و بر کی خموشی ، سلام کہتی ہے
ترے عدم سے ہمیں تو گلہ نہیں ، لیکن
ترے عدم کو یہ ہستی ، سلام کہتی ہے!

یہ ایک بات بھُلائے بھی ہم نہ بھُول سکے
کہ تیرے دل کو یہی کوہسار بھایا تھا!
نحیف جسم کی تیرے بلائیں لے لے کر
اِسی دیار نے اپنا چمن سجایا تھا
مگر یہی ہے وہ منزل بھی ، اے مرے محبوب!
ہمارے ہاتھ سے دامن جہاں چھڑایا تھا!
ہمارے حال سے تُو نے چُرا کے اپنی نظر
نگارِ خُلد کے قاصد سے دل لگایا تھا

ترے فراق کی یہ رات ، بیکراں ہی سہی،
ہم اپنی رات کو انجم فشاں بنائیں گے!
بہت پسند تھے تجھ کو ، یہ دشت ، یہ کہسار
تری پسند کو ہم حرزِجاں بنائیں گے
یہ تند و تیز بگولوں کا ریگزارِ قدیم
ترے لئے اسے ہم گلستاں بنائیں گے
ترا یہ خطّہء کُہسار ، یہ بلوچستان!
تراش کر اِسے جنت نشاں بنائیں گے!

''اخبار بلوچستان'' کوئٹہ ۱۹۵۰ء

کوئٹہ ۱۹۵۰ء

عین مقامِ شوق میں!

موجۂ بحر بے قرار　　لالۂ دشت داغدار!
رنگ کلی کا زرد زرد　　پیرہن اس کا تار تار
شبنمِ غنچہ آفریں　　شدتِ غم سے اشک بار!
نرگس و نسترن خموش　　ساکت و دم بخود چنار!
مُہر بلب ہے عندلیب!　　جیسے کوئی گناہگار!

خلوتِ شب میں ہے نڈھال　　موسمِ گا کا ماہتاب!
اخترِ صبح ، مضمحل　　صبح ، حدثِ اضطراب!
شام ہے داستانِ غم　　رات کو پھر وہی عذاب!

تم تو ثواب کار ہو　　نغمۂ کیف بار ہو!
وقت کے لاڈلے ہو تم　　وقت کے رازدار ہو!

تم ہی بتاؤ، کیوں بھلا رنگ کلی کا اُڑ گیا!؟
سبزہ و گل ہیں کیوں خموش سر و سمن کو کیا ہوا!؟
بادِ سحر کے بھیس میں کون ہے یہ چھُپا چھُپا!؟

کچھ تو جواب دو مجھے آج یہ کیا ہے ماجرا؟
عین مقامِ شوق میں شوق کا کارواں لُٹا!!

''زمانہ'' کوئٹہ (کوئٹہ ۱۹۵۰ء)

کراچی

فضا کے ساز پر دوشیزۂ راحت غزل خواں ہے
نظر جس سمت اُٹھتی ہے اُدھر اک کیف رقصاں ہے
یہ بزمِ سادہ و رنگیں ، بہار آرا ، خمار آگیں
خمار آگیں ، خودی آئیں ، یہ خود اک جامِ عرفاں ہے
کراچی ایک صحرا ہی سہی لیکن خدا شاہد!!
یہ وہ صحرا ہے جو پروردۂ صد سُنبلستاں ہے!
ہمارا نخلِ دل پھولا پھلا آکر کراچی میں،
کراچی نخلِ دل کے واسطے ابرِ بہاراں ہے!
زلیخا بن کے اِس نے یوسفوں کے دل لُبھائے ہیں
کرچی مصر تھا لیکن یہی اب اپنا کنعاں ہے!
تقاضہ ہے ہر اک دل کا یہیں رہئے، یہیں رہیے
روش اپنی ہے،گل اپنا ہے،اپنا ہی گلستاں ہے!
گلستاں وہ جسے فطرت کی رعنائی کا گھر کہیے
وہ رعنائی کہ جس کی خود مشیت زمزمہ خواں ہے
سلام ، اے دخترِ بحرِعرب ! اے دلّیءِ ثانی
عروسِ آرزو! میری نگارِ انجمستانی!

سلام ، اے مشرق و مغرب کی لیلائے فسوں پرور
دلیلِ زندگی ہے تیرے جلوؤں کی درخشانی!
ترے گھونگھٹ میں پایا ہم نے عکسِ گمشدہ اپنا
تری چوکھٹ پہ پہنا ہم نے اپنا تاجِ سلطانی!
یہ تیرا بانکپن،تیرا چلن! تجھ پر وطن صدقے،
کراچی! تیرے نظّاروں میں ہے اک فیضِ روحانی،
فضاؤں میں تری رقصاں ہمارے دیدۂ و دل ہیں
تجھے سونپی ہے ہم نے دیدۂ و دل کی نگہبانی!
تجھے دل دے کے،ہم پھرجامِ جم اس کو بنا لیں گے
ترے پہلو میں رہ کر ہم کریں گے پھر جہانبانی!

'' ماہِ نو ''
'' نوائے پاک '' (کراچی ۱۹۵۱ء)

ذوقِ نمُو

ہے رنگ فضا کا دلبرانہ!
آیا ہے خمار کا زمانہ!
شبنم نے ربابِ برگِ گُل پر
چھیڑا ہے بہار کا ترانہ

گلشن میں مچی ہوئی ہے ہلچل
ہر شاخ سے پھوٹتی ہے کونپل
کانٹوں پہ نکھار آرہا ہے
کلیوں کا سرک رہا ہے آنچل!

سُنبل نے اُٹھا لیا ہے شانہ
نرگس کی نظر ہے عارفانہ
سَوسَن کا تو ذکر ہی نہ کیجیے
ہر بات ہے اس کی اک فسانہ

اک حشرِ نمو ہے آج برپا
انگڑائیاں لے رہا ہے سبزہ
صف بستہ چنار جھومتے ہیں
وادی ہے تمام ایک نغمہ

دریا میں حباب تیرتا ہے
صحرا کو بھی وجد آگیا ہے
اللہ رے ذوقِ خود نمائی
ذرّہ بھی گُہر بنا ہوا ہے

''کاریز'' کا سیم پاش پانی
یہ اس کی چھپی چھپی روانی
کہسار کے دل کی آرزو ہے
ہے جذبِ دروں کی اِک کہانی!

یہ موسمِ گُل یہ اس کے جلوے
جلوے یہ تمام ہیں خودی کے
اے وادیٔ شالؔ! تیرے قرباں،
ہم کو بھی یہ بانکپن سکھادے!

ہم کو بھی یہ رنگ و بُو عطا کر
یہ منزلِ آرزو، عطا کر
اِس میکدہَ زمردیں سے
صدقے ترے! اِک سبُو عطا کر!

''ماہِ نو'' جون۱۹۵۱ء

(کوئٹہ ۱۹۵۱ء)

تجلّیوں کا قافلہ

اُٹھو! اُٹھو! کہ آسماں پہ چھاگئی سیاہ گھٹا
گھٹا کی گود میں مچل اُٹھی ہے عنبریں فضا

نسیمِ بحر ، تند و تیز
شریر و شوخ و فتنہ خیز

رباب نیم شب پہ نغمگی کا گیت گا گئی
کلی کلی کو بر ملا شگفتگی سکھا گئی

رَوش رَوش چمن چمن
اُبل رہا ہے بانکپن

اُمڈ اُمڈ کے آرہی ہے دشت و کوہ سے صدا
جراحتِ دل و جگر کا آج مِل گیا صلہ!!

(۲)

سنو ! سنو! کہ کہکشاں سنا رہی ہے داستاں،
وہ داستاں کہ ہم جسے کہیں حدیثِ کُن فکاں!
ہمارے دل کے ساز کی تھی اصل میں جو اک فغاں!

فضا کا قلب چیر کر
پہنچ گئی جو عرش پر

پلٹ کے آگئی زمیں پہ نغمگی لئے ہوئے،
حیات کے لئے نویدِ سرمدی لئے ہوئے،
خدا کے عرش سے خدا کی روشنی لئے ہوئے،

سنور گئے ہزار طُور!
بکھر گیا تمام نور

اُفق اُفق میں زندگی کا شور گونجنے لگا!
نمود کی تجلّیوں کا قافلہ رواں ہوا!

پکارتا حیات کو
جہانِ ممکنات کو

تراشتا قدم قدم پہ آپ اپنی منزلیں،
نکھارتا وجود کی نئی نئی حقیقتیں،
سمیٹتا ہوا جہانِ عشق و حُسن کی حدیں!!

(۳)

چلو چلو! کہ کائنات کے ہو تم ہی نقش گر!
نسیمِ خُلد ہے تمہارے کارواں کی ہمسفر!
تڑپ رہے ہیں نیم شب میں آج سینکڑوں قمر،
کپاس کے سفید پھول پر ہیں شبنمیں گُہر!

گُہر ہیں کتنے آبدار!
ان پہ مہر و مہہ نثار

یہ پانچ ندّیوں کا دیس،عشق کی یہ سرزمیں!
فضا میں اس کی عطر ہے،ہوامیں اِس کی انگبیں!
کنارِ راوی و چناب فرشِ خاک مخملیں!
خرامِ رودِ سندھ ہے اک رقصِ مرمریں!

یہ رقص پُر شباب ہے!
شباب لا جواب ہے!

قراقرم کی چوٹیوں پہ جھومتے ہیں برگ و بار!
بلندیوں پہ کند کی مچل رہے ہیں آبشار!
پہاڑیوں پہ چاٹگام کی ہے زر بکف بہار!
اُبھر رہے ہیں دشت میں نئے نئے سے لالہ زار!

اِنہیں اُبھارتے چلو
رہینِ جستجو رہو!

کہ جستجو ہے زیست کے تمام درد کی دوا
اسی سے کائنات کی حقیقتوں کا رابطہ!

حقیقتوں کے تاجدار
زندگی کے سحرکار

زندگی کے راستے میں پیچ و خم بھی آئیں گے
ہر ایک خم پہ کچھ قدم تمہارے ڈگمگائیں گے

کہ وہ امیرِ کارواں
ہے محوِ خوابِ جاوداں

مگر وہ چشمِ محوِ خواب اب بھی بے خبر نہیں،
وفا شعار ہو جو تم،تو کچھ تمہیں خطر نہیں،

وفا کا وقت ہے اُٹھو!
پیام عشق کا سنو

کہ تاج و تخت سے بلند ہے تمہارا حوصلہ
خدا کی اس زمیں پر ہو تم ہی نائبِ خدا
یہی تمہاری ابتدا، یہی تمہاری اِنتہا!!

''ماہِ نو''
''انتخابِ ماہِ نو (کوئٹہ ۱۹۵۱ء)

کیا ھوا ، آہ ، اے عندلیبِ چمن

پر وردۂ صد ماہِ درخشاں وہ سحر تھی!
لیلائے تجلّی کی رگِ جاں وہ سحر تھی!
کوثر میں نہائی ہوئی ، شرمائی سی
فردوس کی اِک بنتِ غزلخواں وہ سحر تھی!
سلمائے وطن کے لبِ لعلیں کا تبسّم،
فطرت کی تمناؤں کا عنواں وہ سحر تھی!

سحر کی تجلّئی رقصاں لئے
آرزوؤں کا اِک تازہ عنواں لئے
نُدرتِ زندگی کا لئے اِک فسوں
ایک طیارۂ دلکش و سیم گوں
آپ ہی آپ کچھ گنگنانے لگا
جھومتا جھامتا یوں زمیں سے اُٹھا

جیسے فرشِ چمن سے عروسِ صبا
اپنے آغوش میں نکہتِ سُنبلستاں لئے
وہ اُبھرتا ، سمٹتا ہوا ، ایک نغمہ سناتا گیا

نیلی نیلی فضاؤں میں پاکیزہ سا ریشمی دائرہ جھلملاتا رہا!
پنڈی کے اُفق پر نیلم کے پردوں میں ہوئی اِک جنبش سی
جنبش جو رُکی تو آئی یہ صدا ، نغموں میں پلی ، کرنوں میں تُلی
اے اہلِ گلستاں ، آج یہاں پروردۂ عظمت آتا ہے
یزداں کے پیامی کی صورت وہ قائدِ ملّت آتا ہے
تصویرِ محبت آتا ہے، تفسیرِ اخوت آتا ہے
اے اہلِ کُہستاں ، آج یہاں شاہین عدالت آتا ہے

نکہت بنفس ، گلشن بہ نظر وہ جذبِ دروں کا ایک پیکر
تلوار کے سائے سے ہوتا ہوا آزادی کا وہ لختِ جگر

رونق وہ صد نظّارہ ہوا
دو لفظ ہی کہنے پایا تھا

دفعتً

رُک گئی گردشِ آسماں کہیں لڑکھڑا سا گیا پاسبانِ وطن
کیا ہوا؟۔۔اے میرے خدا اے خدا!۔۔۔۔کون تھا؟

کون تھا بزمِ یزداں میں یہ بندۂ اہرمن؟؟

بوٹیاں نوچ دو،

روند دو، پھینک دو ، پھینک دو،

کوئی بتلاؤ، سمجھاؤ بھی کیا ہوا؟
کیا ہوا ، آہ ، اے عندلیبِ چمن!!

سکوت ہو کہ فغاں ، لا الــــــــــــــــــــــــــــــــہ الا اللہ
صدائے کون ومکان، لا الــــــــــــــــــــــــــــــــہ الا اللہ
پکارتا ہے تلاطم کی گود سے گوہر
صدف میں رہ کے نہاں، لا الــــــــــــــــــــــــــــــــہ الا اللہ
جواں تر ہے حضورِ قدُس وہی مومن
ہے جس کی مرگ جواں، لا الــــــــــــــــــــــــــــــــہ الا اللہ

وہ لالہ زارِ بحرِ عرب بے قرار تھا!

بحرِ عرب کی موج کا سینہ تھا چاک چاک
ساحل پہ، آسماں سے فلک تک غبار تھا
لاکھوں نگاہیں سوئے اُفق تھیں اُٹھی ہوئی
لیکن اُفق کا قلبِ حزیں خود فگار تھا
قلبِ اُفق کے چاک سے نکلا وہ اس طرح
پرچم بدوش، جیسے پیامِ قرار تھا

کہتا ہوا، کہ میری طرح مسکرا بھی دو

'' خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا ''

ہوا یہ شور ، فغاں کے اثر کو دیکھیں گے
صدف میں ہے جو نہاں اُس گہر کو دیکھیں گے
ہے آج ایک نئے طرز سے وہ جلوہ فگن
ہم اس کے جلوے کو، اپنی نظر سے دیکھیں گے
ہے اس کے خون میں غلطاں ہماری تازہ سحر
ہم اُس کے خونِ جگر کو ، سحر کو دیکھیں گے

ہٹا دو پھول کہ پھولوں میں چھپ نہیں سکتا
وہ ایک نور ہے، لاریب، نورِ رحمت ہے
یہ پیرہن ہے گلستاں، یہ داغ ہے لالہ
یہ جسم، جسم نہیں ہے، متاعِ جنت ہے
سروں پہ آج ہمارے خدا کا ہے سایہ
ہمارے دوش پہ اِس عصر کی امانت ہے

ہر چند الم کی شدت ہے　　آہستہ چلو، آہستہ چلو
یہ غم بھی دلیلِ عظمت ہے　　آہستہ چلو، آہستہ چلو

ہر موڑ پہ اک فردوسِ بریں　　ہو آج سے تم ہی جس کے امیں
ہر گام خدا کی رحمت　　آہستہ چلو، آہستہ چلو

بالیں پہ چراغِ نورِ ازل

پائیں میں ابد کے بربط پر کتنے ہی فرشتے نغمہ سرا!
ہوں گے نہ جدا یہ شمس و قمر جو آج ہوئے ہیں پھر یکجا
سوگند ہے ان کی وحدت کی، اے اہلِ وفا، اے اہلِ وفا!

ہم اپنی تمناؤں کا کنول

معمور کریں گے نکہت سے، نکہت کو لُٹاتے جائیں گے
جو ساز انہوں نے چھیڑا تھا وہ ساز بجاتے جائیں گے
کونین کو ان نغموں سے ہم رقص میں لاتے جائیں گے

"ماؤنو"　　(کوئٹہ ۱۹۵۱ء)

مَداوا

آپ ناراض نہ ہوجائیں تو اک بات کہوں!؟

میرے کاشانہ مغموم کی یہ راہ گذر
آپ کو دیکھ کے آداب بجا لاتی ہے
آپ کے گیسوئے پُرخم کی بلائیں لے کر
میری ہر رات مہہ و مہر کو شرماتی ہے!
ان دہکتے ہوئے عارض کے دبستاں پر
میری پُر شوق نگاہوں کی شفق چھاتی ہے!

میرے احساس کی شدّت کو مگر کیا کہیے
شوق کی منزلِ عظمت سے ابھی دور ہوں میں
آپ کی تصویرِ چمن، پیکرِ گلشن ہی سہی
اپنے گلشن کی حقیقت سے ابھی دور ہوں میں
زندگی کتنے جراحات کی پروردہ ہے!
قہر ہے، تابِ جراحت سے ابھی دور ہوں میں!!

حُسن تو حُسن ہے ماحول کے آئینے میں
آپ کو اپنا یہ ماحول دکھاؤں کیسے؟!
مجھ پہ کچھ تلخ حقائق کے ستم ٹوٹے ہیں،
اب خیالوں کے یہ فانوس سجاؤں کیسے؟!
چاہتا میں بھی یہی ہوں کے اُجالے میں رہوں،
اِس اندھیرے کو مگر چھوڑ کے جاؤں کیسے؟!

یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا، خمِ کاکُل تو نہیں،
جو اُلجھ جائے تو ہنستے ہوئے شانہ کردوں!
اس کے ہر پیچ میں، ہرخم میں ہے انسان کا غم،
کیسے ممکن ہے کہ میں اِس کا مداوا نہ کروں!!

''الحمرا'' لاہور
''سحر'' کراچی

(کوئٹہ ۱۹۵۰ء)

برفباری سے پہلے

اگر چہ اب بھی چمن میں بھرے ہوئے ہیں سبو،
رُکا رُکا سا ہے فطرت کا اہتمامِ نمو!
ہُمک ہُمک کے شاخوں سے پھوٹنے والو،
مِرے شریر شگوفو ، کرو بھی فکرِ رفو
کہ اب نسیمِ سحر کا بدل رہا ہے چلن!
مُکر رہا ہے تمہیں سے تمہارا یہ گلشن،
چنار و سرو و سمن پر ہے حزن یوں طاری
بھرے شباب میں جیسے عروسِ نو پہ تھکن!
قضا ہو جیسے چُھپی زندگی کے پردے میں
نظر فروزیٔ شبنم کا دور ختم ہوا!
تمہارے خندۂ پیہم کا دور ختم ہوا!
پناہ گاہوں میں سہمے ہوئے سے ہیں آہو!
کہ ایک نیند اچانک اُنہیں سُلادے گی
چھنک پڑیں گے فضا میں جو برف کے گھونگرو!!

''ماہِ نو'' (کوئٹہ ۱۹۵۲ء)
'' انتخابِ ماہِ نو ''

آئینے ہیں غلطاں غلطاں

صبح سویرے اُٹھ کر جیسے کوئی چھڑائے مانگ کی افشاں ، شاداں ، شاداں
ہنس ہنس جیسے کوئی دکھائے اور چُھپائے جلوۂ تاباں ، نازاں ، نازاں
بزم میں جیسے ساقیءِ مہہ وش سیمیں ساغر چھلکائے ، بجلی چمکائے
صہبا برسے ، مستی اُمڈے ، اُمڈے اِک ایسا طوفاں ، میخانہ بہہ جائے

دیکھ رہا ہوں چُپکے چُپکے جھلمل جھلمل نظارے!
عرش سے گرتے اُجلے اُجلے رِم جھم رِم جھم مہہ پارے!
بوجھ سے جن کے کُہساروں کے شانے بھی تھک تھک ہارے!

عریاں عریاں شاخوں پر ہے سحر کسی کا سلسلہ جُنباں
پیہم رقصاں
آئینے ہیں غلطاں غلطاں!!

آئینوں میں اُمڈا اُمڈا جلوۂ فطرت!
چارطرف ہے لہرایا سا نغمہ رحمت!

جیسے یزداں،
چھیڑ رہا ہے سازِ مستاں!
ٹھہرا ٹھہرا ایک تسلسل، سُلجھا سُلجھا خواب پریشاں!
دیدہ و دل ہیں حیراں حیراں!!

"ماہِ نو" (کوئٹہ ۱۹۵۲ء)

مہتاب شکن اِک شمع جلی

پھر آج مرے کاشانے میں اک ہلچل سی بیدار ہوئی
پھر کہکشاں نے سوتے سے انگڑائی لی ، ہُشیار ہوئی
افلاک کی نیلی وسعت میں اِک تان اُڑی، چہکار ہوئی!

رقصیدہ ہوئے پھر دشت و دمن
دامن میں لئے نادیدہ چمن

محراب میں پھر ارمانوں کی
اِک شمع جلی مہتاب شکن

مہتاب شکن اِک شمع جلی ، پھر بام سجے میخانوں کے
وہ شور گیا، وہ گونج گئی، اڈے ہوئے کچھ طوفانوں کے
لے آئی فضائے نیم شبی عنواں نئے افسانوں کے

افسانوں کے پھر ساز چھڑے!
نغمات مرے پھر راز بنے!

رازوں کی سجل سرگوشی پر
پھر جاگ اُٹھی اِک تازہ لگن

اس تازہ لگن کو کیا کہیے، اِک بانگِ درا، اِک شانِ نمو!
تخلیق کے زرّیں میخانے کا ایک نیا پاکیزہ سبو!
اللہ رے شانِ رندانہ، رندوں نے کیا صہبا سے وضو!
مدہوش ہوئی لیلائے مکاں
آہنگ بنی رفتارِ زماں

رفتارِ زماں کی صورت میں
ہے جلوہ نما میرا ہی چلن

میرے ہی چلن کی ندرت ہے، فردا کی متاعِ شاہانہ!
سر چشمہ خیر و برکت ہے، یہ میرے طرب کا پیمانہ!
تقدیر کُشائے فطرت ہے، میرے ہی جنوں کا افسانہ!
اے میرے جنوں، اے میرے جنوں!
ہو سحر ترا کچھ اور فزوں!

کچھ اور بھی صحرا باقی ہیں
باقی ہے ابھی کچھ اور سخن

ناگفتہ سخن کے دامن میں شبنم بھی، شرر بھی رقصاں ہیں
لبّیک! سوادِ بیتِ حرم! دونوں ہی یہاں پھر ارزاں ہیں

"ماہِ نو" (کوئٹہ ۱۹۵۲ء)

خزاں سوز

شآل کی وادیٔ زرپاش میں مت آنے دو!

چار ہی دن تو ہوئے ہیں کہ کِھلا ہے یہ چمن!
چار ہی دِن تو ہوئے ہیں کہ یہ پھولوں کے چراغ
شدّتِ گریہ شبنم سے ہوئے ہیں روشن!

آج لیکن وہی منحوس، وہی سرد ہوا،
اِن چراغوں کو بُجھا دینے پہ آمادہ ہے
آج پھر اے مرے فردوس! ترے در کے قریب
کُہر اِک تیغ سنبھالے ہوئے ایستادہ ہے!

اِن فلک بوس پہاڑوں پہ بھروسہ نہ کر
کُہر اور یخ کی جفاؤں کے مددگار ہیں یہ!
راہ دے دیں گے، وہ درّاتی چلی آئیں گی،
سرد، بے رحم ہواؤں کے وفادار ہیں یہ!!

میرے نوخیز گُلو! تم ہی سنبھل کر رہنا،
اِس چمن زار کی تقدیسِ نمُو تم سے ہے!
کونپلو! بھول نہ جانا کہ ازل سے اب تک
میری رگ رگ میں رواں گرم لہو تم سے ہے!

عصمتِ جذبہ ہستی کی سپر بن جا نا!
میری سوگند!خزاں سوز شرر بن جانا!

" ماہِ نو " (کوئٹہ۱۹۵۳ء)

خزاں کے نام کبھی جلوۂ بہار کے نام
میں پی چُکا ہوں بہت رنج روزگار کے نام
تجھے گراں جو نہ گزرے تو آج، اے ساقی
لگالوں لب سے یہ ساغر لبِ نگار کے نام!

(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

خدا کرے کہ نہ ٹوٹے کبھی تری توبہ،
خدا کرے کہ نہ توبہ کبھی کریں ہم لوگ!!

(کوئٹہ۱۹۵۳ء)

میرے فسوں کی تازہ کونپل

ہوش رُبا ہے رنگ فضا کا
رات کی زلفیں بھیگی بھیگی!
نکہت سے ہے اُمڈی اُمڈی!
اُمڈا اُمڈا نور کا دریا!
ربی الاعلیٰ ! ربی الاعلیٰ
ربی الاعلیٰ! اذن سے تیرے
تیرے ملائک، تیرا رضواں!
آج کی شب ہیں میرے مہماں!
میرے لبوں پہ تیرے نغمے،
نازاں، نازاں، خاکِ وطن ہے،
بحرِ عرب ہے مضطر مضطر!
ایک صدف میں لاکھوں گوہر!
ذرّہ ذرّہ رشکِ چمن ہے
بوئے ختن ہے صحرا صحرا!

وادی وادی پیکرِ زرّیں
خونِ جگر سے رنگیں رنگیں
کون کہے یہ حُسن ہے کس کا؟
ہر جانب سامانِ تمنا!
آئینہ اپنا ، اپنا جلوہ!
خُلدِ نظارا گوشہ گوشہ!
ہر گوشہ ایوانِ تمنا!
عالم عالم میں ہے ہلچل،
کوہ و دمن میں دھوم مچی ہے
شاخِ نمو سے پھوٹ رہی ہے
مرے فسوں کی تازہ کونپل!
میرا فسوں اللہ کی رحمت،
اُس کی نصرت سحرِ ہے میرا!
ربی الاعلیٰ ! ربی الاعلیٰ

میرا فسوں اعلانِ مشیت!
دوش پہ میرے بارِ جہاں ہے!
میرے ذمے کاکُلِ ہستی!
جب بھی اُلجھی مجھ سے سلجھی!

میرا صلہ اِک قلبِ تپاں ہے!
اور بڑھے گی قلب کی دھڑکن

' وقت کا دامن ، تیرا دامن '

میرا دامن ! تیرا سایہ
ربی الاعلیٰ ! ربی الاعلیٰ!

" ماہِ نو " (کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

یہ فاصلہ، یہ غمِ جادہ.....!

سنور گئے ہیں بہت کچھ ترے خمِ گیسو،
نکھر گیا ہے ترے عارضوں کا رنگِ جمیل!
سنا ہے تیرے تجلّی کدے کے روزن پر
دمک اُٹھی ہے نویدِ نشاط کی قندیل!
ترے سکوت میں اِک راگ تھر تھراتا ہے
مِری عروسِ تمنا میری نگارِ حیات
میں جانتا ہوں تجھے انتظار کس کا ہے!

یہ فاصلہ یہ غمِ جادہ دلخراش سہی،
اُفق پہ تیرے تبسّم کے پھول کھلتے ہیں
چبھے ہیں پاؤں میں کانٹے تو میں نے سمجھا ہے
مری قبائے تمنا کے چاک سِلتے ہیں

مری عروسِ تمنا میری نگارِ حیات
گزر رہا ہوں اندھیروں کے جن نشیبوں سے
وہاں بھی تیرے ہی جلووں کے عکس ملتے ہیں
بھٹک گیا ہوں کسی اور راستے پہ اگر
بہ صد نیاز ترا نام لے کے سوچا ہے
یہ راستہ بھی تو تیرے ہی در کو جاتا ہے!

(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

ذکرِ حیات

رات کے پچھلے پہر جھوم کے آئی جو نسیم
میں نے چپکے سے کہا ، روحِ کہستاں ، تسلیم!
کیا کسی نرگسِ بیمار کی قسمت جاگی؟
آئی آواز کہ ہاں آج اُٹھالو مظراب
سینۂ ساز میں نغموں کی حرارت جاگی!
میں نے بھی چھیڑدیا زمزمۂ ذکرِ حیات
میرے شاداب ترنّم کے سہارے غنچے
شاخساروں پہ مچلنے کے لئے جاگ اُٹھے!
میرے نغموں کے اشارے پہ ہزاروں چشمے
کوہساروں سے اُبلنے کے لئے جاگ اُٹھے!

آخرِ شب کے اُفق سوز اندھیرے کا غرور
میرے افکار کی حدت سے پگھلتا ہی گیا!
میرے فردا کے ہیولوں کا المناک سکوت
پیکرِ حُسن میں ڈھلنے لگا ، ڈھلتا ہی گیا!

(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

☆

تیرے وعدے تیرے پیغام پہ ہے میری نظر
اِک نئی صورتِ آلام پہ ہے میری نظر

جلوئہ صبح سے مایوس ہوئی کچھ اتنی
خلوتِ تیرگئی شام پہ ہے میری نظر

دیکھئے کیا نظر آتا ہے پسِ پردئہ گُل؟
نکہت و رنگ کے ابہام پہ ہے میری نظر
(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

اے تیرگئی شب مجھے معلوم نہیں
ہنگامئہ خورشید بھی تیرا ہی فسوں ہے!
(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

نت نئی برق کے ہر روز پیام آتے ہیں
جو بھی آتے ہیں نشیمن ہی کے نام آتے ہیں !

کاروانِ مہ و انجم سے ذرا کہہ دینا
عرش پر بھی کئی پُر پیچ مقام آتے ہیں
(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

حُسنِ بشر کی تخلیق

زلفِ شب رنگ میں شانہ ہے نہ وہ پیچ نہ خم
عارضوں پر ہے ترے ایک خزاں کا عالم!
اُلجھے اُلجھے سے یہ مژگاں میں ستارے کیسے؟
میری محبوب! تجھے آج ہے کس بات کا غم؟

اتنی غمگیں نگاہوں سے فضاؤں کو نہ دیکھ
ان فضاؤں میں ترے خواب کی تعبیریں ہیں
نیلگوں عرش ، یہ تارے ، یہ ابھرتا ہوا چاند
تیرے ہی حُسنِ فسوں ساز کی تفسیریں ہیں
تُونے دیکھا بھی کہ آفاق کے ہر گوشے میں
تیری آرائش و تزئین کی تدبیریں ہیں!

مسکراتی ہوئی جب لیلیٰ شام آتی ہے
ہر طرف نیلم و یاقوت بکھر جاتے ہیں
تیرے کھیتوں میں یہ گندم کے طلائی خوشے
تیرے ہی جذبہ تخلیق کے گُن گاتے ہیں

تیرے پنجاب کے دریا ، یہ ندی ، یہ نالے
تیری توصیف میں ہر سال اُمڈ آتے ہیں
تیرے بنگال میں برسات کے کالے بادل
دھان کے کھیت پہ کس شان سے لہراتے ہیں

نغمہء سازِ محبت! گُلِ فردوس حیات
مجھ کو معلوم ہے کیا سوچ کے تُو ہے بے تاب
مجھ سے تیرا غمِ پنہاں کبھی پنہاں تو نہیں
ہے مرا عزمِ جواں تیرے سوالوں کا جواب

اتنی مایوس نہ ہو تجھ کو ہماری سوگند
تیری ہی یاس کی تردید کی رات آئی ہے
تیری مژگاں کے یہ معصوم ستارے ہیں گواہ
پھر اُسی عزم کی تجدید کی رات آئی ہے
پھر اُسی شوق کی شدت نے یہ دی ہے آواز
اِک نئے دور کی تمہید کی رات آئی ہے

آج کی رات سے اے میری غزالہ ہوگی
اِک نئے سلسلہء شام و سحر کی تخلیق
بربطِ وقت پہ یوں نغمہ سرا ہوں گے ہم
ہوگی نغمات سے خورشید و قمر کی تخلیق

دشت و صحرا میں بھی ہم رنگ بھریں گے جاکر
خارزاروں میں بھی ہوگی گُلِ تر کی تخلیق
ہے تقاضائے مشیت یہی ذوقِ تعمیر
حُسنِ یزداں ہے یہی،حُسنِ بشر کی تخلیق!

''اخبار ہلال'' (کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

رشتہء بربط و مضراب

حدتِ مہر سے تپتے ہوئے اِک صحرا میں
تشنہ لب طفل کی آواز اُبھر کر جیسے
آتش اندوز فضاؤں میں کہیں کھوجائے!

کچھ اِسی طرح سے اے بربطِ دل! تیری نوا
گیت بن کر مرے مجروح لبوں سے نکلی
اور صحرائے شب و روز میں پھر ڈوب گئی!

میری معصوم نواؤ! مجھے آواز نہ دو
اب تمہیں دل سے بُھلا دینے پہ مجبور ہوں میں
اپنے ایک جزبہء نوخیز پہ مغرور ہوں میں

میں نے اپنا دلِ بے تاب بدل ڈالا ہے،
رشتہء بربط و مضراب بدل ڈالا ہے!

(کراچی ۱۹۵۴ء)

☆

مرے روز و شب کی ظلمت، ترے عکسِ رُخ سے روشن
تری ہر نظر ہے شبنم، مرا ہر نفس شرارا!

ترے عارضوں کے پردوں میں شفق چھپی چھپی سی
مری چشمِ تر کے دامن میں گُھلا گُھلا ستارا!

تیری زلفِ خم بہ خم میں ہیں سَحر کی جلوہ گاہیں
مری دست میں سے باہر یہ سکوں رُبا نظارا!

مرے خونِ دل کی قیمت یہی ایک دو تبسّم
یہی ایک دو تکلّم مری زیست کا سہارا!

مری خامُشی کے بربط میں بھرے ہیں تیرے نغمے
تری برہمی سے میرا ہی خلوص آشکارا!

(کراچی ۱۹۵۴ء)

عید کے دن!

ہے یہ کیسی بہار،عید کے دن　　چھا رہا ہے غبار،عید کے دن
پتّے پتّے پہ مرگ کی مہریں　　غنچہ غنچہ مزار،عید کے دن

دیدۂ اشکبار،عید کے دن　　دامنِ تار تار،عید کے دن
درد اور حسرتِ دوائے درد　　ہیں یہی غمگسار،عید کے دن

سجدۂ بے قرار،عید کے دن　　ہر قدم پہ نثار،عید کے دن
منزلوں سے اُٹھا یہ کیسا دھواں　　اے مری رہگذار،عید کے دن

آرزو بے شمار،عید کے دن　　سب کی سب سوگوار عید کے دن
یہ عنایت،یہ فضل،یہ رحمت　　شکرِ پروردگار ، عید کے دن

ہاں! رہو بے قرار عید کے دن
ہے یہ اعلانِ یار،عید کے دن
مسکرانا ہے ایک جُرمِ عظیم
ہے سزا اِس کی دار،عید کے دن

(کراچی ۱۹۵۴ء)

عید مبارک

چھائے ابرِ بہار عید کے دن
خوب چہکے ہزار عید کے دن
نخلِ دل کی ترے ہر ایک کلی
جھوم اُٹھے بار بار عید کے دن
تیرے مکھڑے پہ بکھرے بکھرے ہوں
گیسوئے تابدار عید کے دن
اور بڑھ جائے اِن آنکھوں کا
ہاں! یہ رنگِ خمار عید کے دن
ماہتابی ہتھیلیوں کی حنا،
ہو شفق درکنار عید کے دن
آنچلوں کے سحاب سے برسے
گوہر شاہوار عید کے دن
ہے دعا میری آ ملے تجھ سے
تیرے دل کا قرار عید کے دن
مانگ میں تیری آ کے بھر دے،وہ
کہکشاں کی قطار عید کے دن
چوم لے جُھک کے تجھ کو، یہ سورج
آسماں ہو نثار عید کے دن
پوچھ مت کیفیت مرے دل کی
ہوں بہت سوگوار عید کے دن

(کراچی ۱۹۵۵ء)

☆

تمہیں تو اس کی خبر تھی کہ میں بھی آؤں گا
لبوں کی مُہر، نظر کا گداز لاؤں گا
سکوں فریب سہی، فریب کھاؤں گا
مرا گمان مگر کچھ غلط نہیں نکلا!
کچھ اور ہوگئے تیور قریب جب پہنچا!!
شکن شکن سی جبیں،وہ شرر شرر سی نظر،
نہ تن کا ہوش،نہ کچھ اپنے پیرہن کی خبر!
یہ برہمی کہ میں کیوں ہوگیا شریکِ سفر؟
سَحَر،نسیمِ سَحَر کے چمن کے پاس ہے کیوں؟
نیاز، ناز کی اس انجمن کے پاس ہے کیوں؟
ہر ایک بات پہ برہم ہوا نہیں کرتے
نشست چھوڑ کر یوں تو اُٹھا نہیں کرتے
غبارِ راہ گذار سے گلہ نہیں کرتے
غبارِ راہگذار میں چراغ جلتا ہے!
غبار میں بھی تو فطرت کا دل مچلتا ہے!

یہ دھوپ اور یہ صحرا کا منظر خاموش!
اُداس اُداس پہاڑوں کا پیکرِ خاموش!
یہ کس کا قہر ہے ایک دفترِ خاموش!
جَلی بھُنی یہ چٹانیں، کٹی پھٹی یہ زمیں!
یہ کس خدا کی ہے جلوہ گاہِ حسیں؟

اِدھر اُدھر کوئی دریا اگر رواں ہوتا
اگر یہ سرو و سمن کا بھی آستاں ہوتا
یہ ریگ زار بہاروں کا رازداں ہوتا
اگر یہاں بھی گھٹا جھوم جھوم کے آتی،
خدا کی شان خُدائی تو گھٹ نہیں جاتی!

ہم ایسے دشتِ جہنم نما سے باز آئے
بنامِ زیست ہم اپنی قضا سے باز آئے
چلو! چلو! کہ ہم ایسے خُدا سے باز آئے
سنبھال لو یہ قبا، آؤ! تیز تیز چلیں!
خدا ہے حُسن، چلو! حُسن کو تلاش کریں!

فلک نما یہ عمارت، یہ چمنیوں کا دُھواں،
فضا میں یہ کیسہ زر کی چمک رقصاں،
یہ کارگاۂ غریبوں کی زیست کا زنداں!
قدم قدم پہ مشینوں کی گھن گرج، یہ شور!
یہ برق اور آہن کے دیوتاؤں کا زور!
کہاں ہو تم؟ اِدھر آؤ! مرے قریب رہو!
یہ کون چیخ رہا ہے، ذرا بتاؤ تو!
سفید اُون کے اِس ڈھیر ہی سے پوچھو
سفید اُون کا یہ ڈھیر کس کی دولت ہے؟
لہُو سے کس کے فروزاں یہ چراغِ صنعت ہے؟
یہاں چراغ تلے ظلمتیں دھڑکتی ہیں
برہنہ جسم یہاں محنتیں دھڑکتی ہیں
یہاں مشینیں نہیں، قسمتیں دھڑکتی ہیں
یہ زر پرست خُدائی کا دم بھریں تو بھریں!
خدا ہے حُسن، چلو! حُسن کو تلاش کریں!

کہیں سفید ، کہیں نیلگوں ، کہیں اُودا!
سنہری دھوپ میں رنگوں کا حشر ہے برپا
گراں نہ ہو تو خمِ زلف سے کہو کہ ذرا
تمہارے چاند سے ماتھے پہ کچھ بکھر جائے!
سنہری دھوپ میں یہ روپ کچھ نکھر جائے!
اُفق سے لے کر اُفق تک یہ دلرُبا ہلچل!
بہت پرے،وہ اُدھر کیا ہے؟ دُھند یا بادل؟
لبِ حسیں کے ذرا تھرتھرائے تو ہیں کنول!
سنو!سنو! وہ سمندر سے پھر صدا آئی
نظر نظر میں ذرا ناپ لو یہ گہرائی!
ذرا یہ اِذن تو دو آج گُنگُنالوں میں
حریمِ شوق کی شمعوں کو جگمگالوں میں
کنارِ بحر کے ماہِ تمام! اک سجدہ!
بس ایک سجدہ!بہ صد احترام اک سجدہ!

اُبھر اُبھر کے یہ بڑھتی،جھومتی موجیں،
یہ ڈوبتی،یہ اُچھلتی،یہ گھومتی موجیں،
تمہارے نقشِ کفِ پا کو چومتی موجیں،

یہ موج کیا ہے؟ یہ موجوں کا اضطراب ہے کیا؟
گراں نہ ہو تو بتادو کہ پیچ و تاب ہے کیا؟

نہیں! جواب کی حاجت نہیں، جواب نہ دو!
بس اِک نظر ہی بہت ہے،مگر جو دیکھ سکو!
یہ فرشِ ریگ ہے بھیگا ہوا،سنبھل کے چلو!

یہ سنگ آب زدہ ہے،ذرا ہٹالو قدم
ذرا سنبھال لو دامن کہ ہو نہ جائے نم!

اُدھر نہ جاؤ کہ برپا ہے دوسرا محشر!
صدف کی گود میں مچلا ہوا ہے اِک گوہر!
گُہر! کہ اصل میں جو ہے صدف کا خونِ جگر!

تمہیں بتاؤ کہ خونِ جگر بھی دیکھا ہے؟
بہت گراں ہے،مگر یہ گُہر بھی دیکھا ہے؟

یہاں مشین کی گھڑ گھڑ، نہ زر کا ہے انبار
تضادِ محنت و سرمایہ کی نہیں پیکار
یہاں لہو کا نہیں دور تک کہیں بازار
نہ مارشل ہے نہ پیگو نہ مارکس کے احکام!
ولی کا بندہ ہے، نہ شیطان کا کوئی غلام!

غریبِ شہر یہاں آئے، شہر یار آئے
گدائے راہ ہو، یا کوئی تاجدار آئے
ہو پارسا کہ مجھ سا گناہگار، آئے
یہ مَدّ و جزر ہے سب کا، یہ جھاگ سب کا ہے
فضا کا ساز، یہ موجوں کا راگ، سب کا ہے

نگارِ زیست! یہاں مشترک مسّرت ہے
کنارِ بحرِ عرب، ہم سبھوں کی جنت ہے
یہ آدمی کی نہیں، یہ خُدا کی صفت ہے
خُدا ہے حِسن، مگر حُسن کیا ہے؟ کون کہے!
یہ دل کی بات ہے، لب تک نہ آئے، دل میں رہے!

یہ رنگ رنگ کی کاروں کی دیدہ زیب قطار!
کہاں سے آ گئی اِس کارگاہ میں یہ بہار!
مگر بہار کا پوچھو تو کون ہے معمار!

یہ جنّتیں ہیں،مگر یہ سجی ہیں کس کے لئے؟
یہ نرم نرم نشستیں بنی ہیں کس کے لئے؟

چمک رہی ہیں ابھی تو یہ کہکشاں کی طرح
رواں جو ہوں گی کسی جوئے نغمہ خواں کی طرح
گُلوں کے فرش پہ شبنم کے کارواں کی طرح

ذرا یہ پوچھ تو لو،اِن میں کون بیٹھے گا؟
کوئی غریب کبھی یہ خواب تک دیکھے گا؟

بہت حسین بہت خوشنما ہے یہ صنعت
کہ دھات ہاتھ میں لے کر تراش دیں جنت
مگر یہ زر کی خدائی ہے،زر کی لعنت

یہ ناگنیں تو ہمیں کو قدم قدم پہ ڈسیں!
خدا ہے حُسن،چلو! حُسن کو تلاش کریں!

نظر نظر میں ہیں کچھ طور جھلملائے ہوئے!
چلو کہ لوٹ چلیں ہم نظر جھکائے ہوئے!
ذرا سنبھال لو گیسو، ہیں تھرتھرائے ہوئے!

غبارِ راہگذار میں مچل رہا ہے دل!
کسے خبر کہ کہاں ہے غبار کی منزل؟

غبارِ راہگذار کی دُعا لئے جانا!
دھڑکتے دل کی بس اِک دو صدا لئے جانا
اَبد اَبد کا عہدِ وفا لئے جانا!

مگر وہ ایک نگہہ پھر! کہ غم سنور جائے!
مری حیات کی کشکول کچھ تو بھر جائے!

(کراچی ۱۹۵۵ء)

مرے حسین مصوّر

شراب و شعر کے تازہ جہاں کی ہے تصویر!
کہ رنگ و بُو کے کسی کارواں کی ہے تصویر!
گلے میں پھول،کلائی میں پھول،زلف میں پھول،
قسم صبا کی،یہ اِک گلستاں کی ہے تصویر!
یہ ابروؤں کے حرم،یہ لبوں کی قوسِ قزح!
یہ چشم کیفیتِ جاوداں کی ہے تصویر!
یہ رُخ پہ اِک خمِ گیسو! سَحر کے دامن میں
بس اِک لمحہء ظلمت نشاں کی ہے تصویر!
سنہرا جسم ، روپہلی قبا ، تری سوگند
شفق کے سائے میں آبِ رواں کی ہے تصویر!
فسانہ اور حقیقت کا ایک سنگم سا!
دوا اور درد کے اِک درمیاں کی ہے تصویر!
مری جبیں کر رہی ہے ازل سے جس کی تلاش
بتا بھی کیا یہ اُسی آستاں کی ہے تصویر؟

مرے حسین مصور! کہاں کی ہے تصویر؟
مرے حسین مصور! جہاں کہیں کی ہو،
کسی کی ہو،مجھے اک بار پھر دکھا دینا!
کہ یہ نقوش ! ابھی تو بہت ہی پھیکے ہیں
مرے جگر کا لہو اس میں کچھ ملا دینا!
گلے میں پھول،کلائی میں پھول،زلف میں پھول!
یہیں کہیں مرے دو اشک بھی چُھپا دینا!
یہ ابروؤں کے حرم دھندلکوں میں ہیں روشن
مرے نَفَس کے شراروں سے جگمگا دینا!
یہ چشم کیفِ مسلسل سہی ، مگر ان میں
مرے الم کی بھی کیفیتیں بسا دینا!
دوا و درد کے اِک درمیاں کی ہے تصویر،
دوا کے بدلے ذرا درد ہی بڑھا دینا!
فسانہ کیوں ہے ، حقیقت اسے بنا دینا!
بنا کے میری نگاہوں سے پھر چُھپا دینا!

''مصوّر'' پٹنہ (کراچی۱۹۵۵ء)

چراغاں

بے کراں درد کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
آج میرے دلِ بیمار کی اِک اِک دھڑکن
ہر نَفَس ایک بگولہ ہے کہ جس کی زد میں
خواب آلودہ تمناؤں کا بے خواب چمن!
میری اس ہستی موہوم کا اِک اِک لمحہ
جیسے ہو زیرِ شجر برگِ شجر کا مدفن
دل کی یہ آگ بھی کیا شے ہے کہ جس میں یارب
جسم و جاں ہی نہیں،جل اُٹھے ہیں کہسار و دمن!

(۲)

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب فیضِ نظر سے اے دل
نخلِ امید کی ہر شاخ ہری رہتی تھی!
جتنی کونپل تھی ستاروں سے بھری رہتی تھی!
وقت کے نغمۂ رنگیں کے اثر سے، اے دل
پھول ہی پھول کھِلے رہتے تھے، دامن دامن،
میری ہر صبح تھی مینا،مری ہر شام شراب!

میری ہر شب سے ترش جاتے تھے کتنے مہتاب!
اُف ری یہ تلخ حقیقت! اُنہیں مہتابوں نے
رکھ دیئے بُن کے مرے شوق کے کتنے ہی کفن!

(۳)

کون جانے کہ مہہ و سال پہ کیا کیا گزری!
مجھ پہ جو گزری ہے اب اُس کو بیاں کون کرے!
بھولے بھٹکے ہی سہی کس نے نہ دیکھے ہوں گے
پھیلے پھیلے سے یہ ہر سمت تمنا کے کھنڈر،
اُکھڑی اُکھڑی سی یہ دیوار، یہ ہلتے ہوئے بام،
ہر طرف کہنہ و بوسیدہ نظاروں کا خرام،
دیوتاؤں نے جنہیں روز کئے جُھک کے سلام،
جن کی خاطر اِنہیں ٹیلوں پہ چراغاں بھی ہوئے!
کتنے ہی اہلِ نظر جن کے ثناخواں بھی ہوئے!

(۴)

اُن میں اے دل! کہ جو تھے اہلِ نظر، اہلِ جبیں،
خاتمِ دردِ تمنا کے جو تھے تازہ نگیں

نام میرا بھی لیا جاتا تھا،گاہے گاہے
مجھ کو اُن کی سی بلندی تو میسّر نہ ہوئی
اُن کی ہر جنبش لب میں تھی نوائے الہام
میری آواز بس اک کوششِ گفتار رہی
پھر بھی کچھ اتنی عقیدت سے،محبت سے،یہ ساز
میں نے اس بزم میں چھیڑا تھا بصد عجزونیاز
میرا نغمہ بھی سُنا جاتا تھا،گاہے گاہے
نام میرا بھی لیا جاتا تھا،گاہے گاہے
رفتہ رفتہ مرے نغموں پہ تھکن چھانے لگی!
لحظہ لحظہ مری آنکھوں پہ کھلا رنگِ چمن!
اُف ری یہ تلخ حقیقت!کہ بہاروں کے عوض
میں نے دراصل خزاؤں کے کئے تھے درشن!

اور خزاؤں کے اِسی در پہ جبیں ٹیک کے میں
بول اُٹھا تھا کہ یہ پھولوں کا محل میرا ہے!
بول اُٹھا تھا کہ اَبد میرا،اَزل میرا ہے!

(۵)

میرے خاموش ابد ، اے مرے خاموش ازل!
میرے سجدوں کو تو اِس در نے دیا ہی دھوکہ

میری اس بے بصری سے ہوئے تم بھی رُسوا
میری آزردگی ذوقِ نمو کی ہی قسم
میرے ماتھے،مرے سجدے کے لہو کی ہی قسم
میرے خاموش ابد ! اے مرے خاموش ازل!
تم ہی رہنا مرے اس قلب کی دھڑکن کے گواہ

پنجہ شب نے گلا گھونٹ دیا ہے لیکن
آؤ! اے میرے مہہ و سال! اِدھر آؤ، سنو!
میرے وجدان کی گہرائی سے آتی ہے ندا
شب کی ظلمت میں نظاروں کی یہ اُڑتی ہوئی خاک
صبح کا غازۂ رخسار بنے گی اِک دن
لب کے زنداں میں مقید مرے الفاظ کی آنچ
پختہ ہو کر گل و گلزار بنے گی اِک دن
اور کچھ تیز جو ہو جائے گی دل کی دھڑکن
اے مرے فن تیری جھنکار بنے گی اِک دن
اے مری زیست، یہ شہکار بنے گی اِک دن

"ادبِ لطیف" (کراچی۱۹۵۵ء)

مدّ و جزر

(۱)

جب سے دیکھا ہے آپ کو میں نے
اِک نیا انقلاب پاتا ہوں!
ابر بے کیف، چاندنی بھی اُداس
پھیکی پھیکی شراب پاتا ہوں!

(۲)

چشمِ حسرت ہے اشک آلود
دل میں ہیں اضطراب کے شعلے
آپ کی اِن حسین آنکھوں نے
جانے کیا کہہ دیا مرے دل سے

(۳)

آپ صبحِ بہار ہیں شاید
نغمہ آبشار ہیں شاید
یہ بیاباں ، یہ دشت ، یہ کُہسار
لالہ کوہسار ہیں شاید

(۴)

آپ کو اپنے خانہ دل میں
شمع ارماں بنا کے رکھوں گا
یوں سمجھئے کہ جیسے صحرا میں
اِک گلستاں بنا کے رکھوں گا

(۵)

نا چشیدہ شراب لائی ہیں!
اِک اچھوتا رباب لائی ہیں!
سادہ سادہ سے پیرہن میں آپ
انتہائے شباب لائی ہیں!

(۶)

آج پھر آپ کو جو دیکھا ہے،
میں نے سوچا ہے زندگی کیا ہے؟
اِک تبسّم ہے آپ کے لب کا
یا مرے دل کا ایک شعلہ ہے؟

(۷)

آپ سازِ حیات کا نغمہ
نا شنیدہ سا، کچھ شنیدہ سا!
آپ فطرت کے قلب کی دھڑکن
ماورائے مجاز کا پردہ!

(۸)

شوق کو کامیاب کرتا ہوں!
آپ سے پھر خطاب کرتا ہوں
روکئے! روکئے! مجھے للہ!
جرم کا ارتکاب کرتا ہوں!

(۹)

رشکِ نسریں و یاسمن ہیں آپ
پھول کیا چیز ہے، چمن ہیں آپ
آپ کو لازوال کردوں گا
میں ہوں فنکار، میرا فن ہیں آپ

(۱۰)

پیکر و پیرہن کی سازش سے
چشمِ نظّارہ کی ہے رُسوائی
آسمانی قبا ، گلابی جسم
معجزہ ہے تمہاری رعنائی

(۱۱)

چاندنی ، ابر ، خواب اور نغمہ
ہیں کئی تیرے پیرہن کے نام!
پھول ، گوہر ، شراب ، انگارہ
کیسے کیسے ہیں، اِس بدن کے نام!

(۱۲)

ہے تبسّم ترا حیات افروز
اس کو لیکن قضا بھی کہتے ہیں
عشق کا کوئی نام ہو کہ نہ ہو
حُسن کو ہم خدا بھی کہتے ہیں

(۱۳)

انگبینیٔ لب سے ہے پیدا
میرے زہرابِ غم میں شیرینی!
فصلِ گُل؟ رنگ؟ خیر! کچھ ہوگا!
میں نے دیکھی ہے تیری رنگینی!

(۱۴)

تیری قربت کے اِن ہی لمحوں میں
میں نے رازِ حیات پایا ہے
موت کی منزلوں سے گزرا ہوں
جب بھی دورِ فراق آیا ہے

(۱۵)

آج کل اک عجیب عالم ہے
امتزاجِ مسرت و غم ہے
دل میں رہتا ہے مستقل اک درد
ایک آرام سا بھی پیہم ہے

(۱۶)

بارہا زندگی سے گھبرا کر
خالق زندگی کو یاد کیا
عرش سے جب مِلا نہ کوئی جواب
میں نے چُپکے سے تیرا نام لیا

(۱۷)

سانولا، سانولا سا نازک روپ
جیسے صبحِ ازل کی پہلی پَو
چال کی ہر لچک پہ شرمندہ
شمعِ کعبہ کی تھرتھراتی لَو

(۱۸)

رہزنِ ہوش کو ضحیٰ کا سلام
نغمہ بردوش کو ضحیٰ کا سلام
بادلو! آج تم ہی کہہ دینا
اُس خطا پوش کو ضحیٰ کا سلام

(۱۹)

رشکِ مہتاب و آفتاب بنو!
ساقی و ساغر و شراب بنو!
میں تو محرومِ صد تمنّا ہوں
تُم، تمنّائے کامیاب بنو!

(۲۰)

اِک تبسّم، بس ایک دو جملے
کتنی رنگیں تھی زندگی میری
کس قدر مختصر تھا وہ لمحہ
کاش! اُس لمحہ ،موت آجاتی

(۲۱)

اس خودی اور بے خودی کا سلام
میرے غم کا،مری خوشی کا سلام
زندگی کیا ہے؟ وقفہء قربت
تیری قربت کو زندگی کا سلام

(۲۲)

چُپ ہو کیوں؟ زندگی کی بات کرو
کچھ میری بے بسی کی بات کرو
رُخ پہ لہرادو آج پھر گیسو
آؤ! کچھ چاندنی کی بات کرو

(۲۳)

یہ تپش ، یہ خلش ، یہ محرومی
یہ مرا اضطراب، مت چھینو!
میں بڑھوں،فاصلہ بھی بڑھ جائے
مجھ سے میرا سراب مت چھینو!

(۲۴)

چھیڑ کر زندگی کا سازِ خموش
نغمہ کامیاب کی تخلیق!
جُرم میرا، ہجومِ ظلمت میں
جلوۂ آفتاب کی تخلیق

(۲۵)

جُرم میرا یہی کہ میں نے تجھے
پیکرِ رنگ و نور کہہ ڈالا
ہاں! بجا! میں کوئی کلیم نہ تھا
کیوں تجھے ایک طور کہہ ڈالا

(۲۶)

جُرم میرا کہ جلوۂ گُل کو
میں نے شبنم کا آئنہ بخشا
کیوں نہ اقبالِ جُرم کر لوں میں
ہاں! کیا میں نے یہ گناہ، کیا

(۲۷)

گیسوئے عنبریں کے سائے میں
چند لمحے گذار آیا ہوں
اے غمِ زیست! انتقام نہ لے
میں وہاں سے بھی ہار آیا ہوں

(۲۸)

میرے پہلو میں اپنے ہاتھوں سے
میرا ٹوٹا رُباب رکھ دینا
میں جو مرجاؤں تو لبوں پہ مرے
آ کے، برگِ گلاب رکھ دینا

(کوئٹہ / کراچی ۵۳/۱۹۵۴ء)

سلامِ شوق

مرے سلام پہ شاید کہ مسکرائیں آپ!
فرازِ حدِ نظر تک کِھلے ہوئے ہیں گلاب!
لچک رہی ہے ستاروں کی اک حسیں کونپل
تصوّرات کی قندیل جگمگاتی ہے،
خیال و خواب کی رعنائی گنگناتی ہے

اِنہیں لطیف اچھوتے لبوں کے دامن پر
ہزار بار تبسّم کا رقص دیکھا ہے
مگر یہ لوچ، یہ نازک شگفتگی، یہ چٹک
قسم نمودِ سحر کی، کبھی نہیں دیکھی
مجاز جیسے یہی ارتعاشِ مبہم ہے

مرے سلام میں ایسی تو کوئی بات نہ تھی
کہ جس پہ قوسِ قزاح تھرتھرا کہ رہ جائے
نگاہِ شوق کو کچھ گُد گُدا کے رہ جائے
مرے سلام میں ایسی تو کوئی بات نہ تھی

''ماہِ نو''　　　(کراچی ۱۹۴۷ء)

آئنس ٹائن

تخیّل نے ترے برپا کیا اِک انقلاب ایسا
نظامِ مہر و مہہ بدلا، نظامِ زندگی بدلا
تفکّر نے ترے اِک اِک حقیقت کی گرہ کھولی
تری ہر جنبشِ لب نے پیامِ آگہی بدلا

خرد والے لئے بیٹھے تھے اپنی شمعِ افسردہ
ترے وجدان کے شعلے نے اُن کو روشنی بخشی
جو گھِر کے رہ گئی تھی چند میکانی اصولوں میں
وہ فطرت کتنی شوخی سے تجھے پاکر مچل اُٹھی!

ترا اِدراک تھا کتنی ’’ ساواتوں ‘‘ کا گہوارہ
ترا احساس کتنے نَو بہ نَو جلوؤں کا آئینہ
ترے قدموں نے تاج و تختِ اسرائیل ٹھکرایا
تری شانِ گدائی تھی جہاں بانوں کا آئینہ

یہ نکتہ ہم کو تیرے '' ضابطے '' ہی نے سکھایا
کہ'' ذرّے'' اور' توانائی'' کا ہے کیا اصل میں رشتہ
زماں کا رازِ مبہم اور مکاں کی بے نشاں وسعت
حقیقت میں بس اک سازِ'' اضافیت'' کا ہے نغمہ

ترا بخشا ہوا ذوقِ نظر،اے پیکرِ دانش
سماوی کاروانوں کی کہیں منزل نہ بن جائے
'' عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے''

'' جدید سائنس ''کراچی (کراچی۱۹۵۶ء)

دشنۂ نَو

رات پھر مجھ سے مری مُہرِ سکوتِ لب نے
ہنس کے پوچھا کہ مرا ذوقِ سخن کیسا ہے؟
میری تشبیہوں کے افسوں کا ہے اب کیا عالم؟
استعاروں کی بہاروں کا چلن کیسا ہے؟
فکر کی کاکُلِ خمدار کا کیا ہے مزاج؟
لطفِ نشاطگیٔ شانۂ فن کیا ہے؟

زہر خندِ لب خاموش! تری خدمت میں
تحفۂ خونِ سخن پیش کروں یا نہ کروں؟
ناوکِ طنز سے تیرے جو نکھر آیا ہے
تجھ کو وہ جلوۂ فن پیش کروں یا نہ کروں؟

(۲)

میں تو چپ تھا کہ عجب کیا مری زلفِ افکار
سنتِ شانہ اشعار کے شایاں ہی نہ ہو
میری تشبیہوں کے عارض پہ خزاں کا ہو غبار

استعاروں کے ہیولوں میں کوئی جاں ہی نہ ہو!
میں تو چپ تھا کہ عجب کیا مرا فن ہو بیمار!
دل کی دھڑکن میں ہم آہنگی دوراں ہی نہ ہو!

زہر خندِ لب طنّاز مگر یہ تو بتا،
کیوں بھری بزم میں چُپ ہیں یہ سخندانِ حیات ؟
نُدرتِ زیست کے جلووں کی بشارت دے کر
گُم کہاں ہو گئے یہ جلوہ فروشانِ حیات؟

کل جو برہم تھے کہ طاری ہے نظاروں پہ جمود
آج کیوں مرگِ نظارا پہ نہیں وہ برہم؟
کل جو ایک ایک کلی کے لئے لڑ جاتے تھے!
شورشِ سنگ و شرر سے جو گزر جاتے تھے!
آج کیوں بھول گئے اپنے جُنوں کا وہ چلن؟
کب سے میں ڈھونڈھ رہا ہوں اُنہی دیوانوں کو
دار تھا جن کا اِک آئینہ تو شانہ تھی رسن
تُو ہی کہ دے کہ میں اُن گُم شدہ فرزانوں کو
خندۂ دارورسن پیش کروں یا نہ کروں؟

(۳)

اپنے کاندھوں پہ لئے جوشِ جنوں کا تابوت
کون زنجیر بہ پا جاتا ہے مدفن کی طرف؟
کس کے بدرنگ خدوخال کا اندھا چہرا
تک رہا ہے اُفقِ تار کے روزن کی طرف
اور روزن پہ اُفق کے یہ تھرکتی ہوئی برق
جس کی ہے نظر آج میرے نشیمن کی طرف!
اور ایسے میں کسی قصر سے نکلا یہ کون؟
تیغ در دست بڑھا زیست کے گلشن کی طرف!
کس نے مخمل میں لپٹا ہوا پنجہ گاڑا،
میری گردن کی طرف ، قلب کی دھڑکن کی طرف

کون عالم ہے یہ؟ کچھ بول تو اے مہرِ سکوت ؟
کون عالم ہے یہ؟ناسوت کہ ہے جبروت؟

اور ایسے میں کہاں ہیں مرے فردا کے امام؟
حسرتِ زیست کہاں ہیں وہ حلیفانِ حیات

حُسنِ یوسُف، دمِ عیسیٰ ، یدِ بیضا والے،
غیرتِ زیست! کہاں ہیں وہ نقیبانِ حیات؟

(۴)

کوئی آواز،کسی سمت سے بس اِک آواز
فن کے دیوانے کی، یا زیست کے فرزانے کی
مُہر ہی لگنے کی، زنجیر ہی پہنانے کی!
کوئی آواز،کسی سمت سے بس اِک آواز،
دشنۂ نو ہی کے شہہ رگ میں اُتر جانے کی!

(۵)

دشنۂ نو! تری بے باک جسارت کو سلام
اتنی بھرپور شقاوت کی مہارت کو سلام
میری شہہ رگ! تری اس تازہ شہادت کو سلام

میری شہہ رگ میں بہ لطفِ روشِ دشنۂ نو
مژدہ زیست کی اِک جوئے وفا پلتی ہے!
ہاں! وہی جوئے وفا جس کے کیفِ سیمیں پر

عطر ملتی ہے سحر، شام حنا ملتی ہے
ہاں! وہی جوئے وفا جس کا طربناک خرام
ہے کہیں نیل کا آہنگ، کہیں رنگِ فرات
مژدہء زیست، مری مرگ ہے تجدیدِ حیات!

''مہرِ نیم روز '' (کراچی ۱۹۵۸ء)

انــقــلاب کــی رات

آخری قطرۂ خوں ہے سرِ مژگاں معبود
میرے اس ہدیہ ناچیز کی رکھ لے کچھ لاج
سبزہ و سرو و سمن ہی نہیں میرے مسجود!
ہوگئی چشمِ نظارا بھی خزاں میں تاراج
یہ جہنم، یہ جہنم کے مسلسل جھونکے!
پیرہن ہی کے نہیں،دل کے اُڑے ہیں پُرزے!
نارِ نمرود کو گلزار بنانے والے!
کب مری آتشِ ایّام کا بدلے گا مزاج؟
کب مرے مصر میں ہوگا کسی موسیٰ کا ورود ؟

آواز!!؟

یہ کیسی آواز!!؟

جیسے شبنم کے کفِ گُل پہ ٹپکنے کی چھنک!
چاندنی رات میں جیسے کسی گھونگرو کی کھنک!
کس کے ہاتھوں سے گرا جام کہ گونجی یہ جھنک!
جام ٹوٹا کہ گرا فرق سے فرعون کے تاج!؟

(۲)

کس کے قدموں کی یہ آہٹ ہے کہ پھر دل کا گُداز
روح کی آنچ میں پالے ہوئے ماتھے کا نیاز
پھول بن بن کے سرِ راہ بکھر جاتا ہے!
اشک، مژگاں پہ گُہر بن کے سنور جاتا ہے!

کتنے نادیدہ ستاروں کو جلو میں لے کر
قصرِ ظلمت کی طرف کون چلا آج کی رات؟
شاطرِ شب نے جہاں خود کو چُھپا رکھا ہے
اُسی خلوت کی طرف کون چلا آج کی رات
تیری آہوں کے شراروں کو جلو میں لے کر
کس نے اے دل! ترے غدار کو للکارا ہے!
میرے آقا،مرے سرکار کو للکارا ہے!

(۳)

بھاگتی رات کو ہم راہِ سفر دیتے ہیں!
کوچ کر جائیں اندھیروں کے سفیرانِ سیاہ

ہم کُھلے دل سے اُنہیں اذنِ سفر دیتے ہیں
ہم کسی خون سے ہولی نہیں کھیلیں گے، کہ ہم
آدمیت کی بلندی کی خبر دیتے ہیں،
ہم مکافاتِ عمل کے بھی مگر قائل ہیں!
اہلِ شر سُن لیں کہ ہم بدلہ شر دیتے ہیں!
ہاں! مگر وہ کہ جو کوتاہ نظر ہیں اب تک
ایک بار اور اُنہیں درسِ نظر دیتے ہیں!

(۴)

ایک بار اور! مرے مردِ مجاہد! اک بار!
تیری تقریر میں ہے سیفِ خودی کی جھنکار
تیرے لہجے میں ہے وہ عزم کے جس کے آگے
سرنگوں عرش کے ہمدوش ہمالہ کا وقار!
اِک اشارے پہ ترے سدِّ سکندر مسمار!
ایک بار اور! مرے مردِ مجاہد! اک بار!
قلعہء وقت کے مینار سے پھر مجھ کو پُکار!

(۵)

میرے ایّام کے زنداں کی فصیلوں کا غرور
میرے قدموں میں بچھا جاتا ہے،دیکھے کوئی

دل کے رِستے ہوئے ناسور ہیں کتنے پُر نور!
روئے خورشید جِلا پاتا ہے،دیکھے کوئی
سینہ عصر میں ہاں! پھر مرا پیکانِ شعور
آج پیوست ہوا جا تا ہے،دیکھے کوئی!

کوئی پھر آج یہ دیکھے کہ بیک نعرۂ شوق
کس طرح گردشِ تقدیر بدل جاتی ہے!
ہو لہو گرم تو زنجیر پگھل جاتی ہے!

(کراچی ۱۹۵۸ء)

موجِ مہِ نیم شب

(منوڑا کی ایک رات کے تاثرات)

(۱)

تازہ بہ تازہ ہر اُفق!
پھول اِدھر، اُدھر شفق!
دفتر زندگی کا ہے
زیرِ نظر ورق ورق!

صفحۂ آب، تہہ بہ تہہ!
جیسے سراب، تہہ بہ تہہ!
خواب نہیں ہے پھر بھی ہے
عالمِ خواب، تہہ بہ تہہ!

دیدۂ و دل ہیں مُرتعِش
اُف ری، یہ جاں فزاں خلش
کون کرے گا اعتبار
چاندنی رات اور تپش

(۲)

فرش سے لے کر عرش تک
ایک عجیب سی چمک!
دیدۂ نم بتا ذرا!
آئی کہاں سے یہ دمک؟

موج سے موج ہمقدم!
رنگ میں روشنی کا رَم!
لحظہ بہ لحظہ اِک یقیں
ایک فریب دمبدم!

دوش بہ دوش بحر و بر
ہے جو صدف، وہی گہر!
جھاگ میں گھُل کے اُڑ گئے
شعلہ و شبنم و شرر!

شبنم و شعلہ ہم نفس
تشنہ لبی پہ کس کو بس!

ڈھال دے پھر مری شراب
آتش و آب کا یہ رس!

آتش و آب، زندہ باد!
حسن و شباب، زندہ باد!
میرے قصورِ زیست پر
تیرا عتاب، زندہ باد!

(۳)

لوگ ہیں کس قدر ملول!
ہوش عبث ، خرد فضول!
برق کو بڑھ کے چوم لیں
برق ہے ، یاسمن کا پھول!

سنگ ستاں ہے لالہ زار!
جوئے رواں ہے کوہسار!
خار؟ نہیں! نہیں! کہ ہے
قوسِ قزح کی اِک بہار!

قوسِ قزح ہے آرزو!
مہر کی جس سے آبرو!
مہر ہے سوز کا رسول
اور یہ سوز ہی نمُو!

موجۂ مدِّ نیم شب!
میں نے فغاں جو کی تو کب؟
ارض و سما گواہ ہیں
مجھ کو گِلہ نہ تب، نہ اب!

رنج و الم کے باوجود
دیدۂ نم کے باوجود
آج بھی نغمہ زن ہوں میں
شدتِ غم کے باوجود

آج بھی ہے رواں دواں
ہاں! وہی جامِ زرفشاں!
میرے غرورِ زیست کا
بحرِ عرب ہے ترجماں!

(۵)

دیکھ! چھلک گیا شرر،
جام اُٹھا،سبو تو بھر!
جام! بنامِ زخمِ دل!
جام! بنامِ چارہ گر!

آنے کو ہے پیامِ صبح!
ایک سبو، بنامِ صبح!
موجِ نسیم و موجِ آب
دونوں ہیں ہمکلامِ صبح!

قطرۂ آخرِ شراب!
میری نوائے کامیاب!
میرے ہی دل کا قرص ہے
نام ہے جس کا آفتاب!

''مہرِ نیم روز''

(کراچی ۱۹۶۰ء)

سایہ خدائے ذوالجلال

پاک سر زمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد

نظم و ضبط و اتحاد شاد باد!
شانِ عزم و اعتماد شاد باد!

شاد باد ! جذبہء جہاد

دلبرانِ آسماں ، مہر و ماہ کے ہم نشاں
رہبرانِ بحر و بر، بزم کار و رزم گر
فاتحانِ جوڑیاں حریت کے ترجمان!
پُرشکوہ و سربلند، غازیانِ حق پسند

پاسبانِ دین، شاد باد

دوارکا! وہ دشمنانِ دیں کی گھات
دوارکا! وہ ہندِ نو کا سومنات

ہاں! بنامِ غزنوی،
ایک ضربِ حیدری!

دوارکا پہ چھاگئی، ابد ابد کی سرد رات
پھٹ گئی ہے دشمنوں کی صف
شکست ہے ھدف! ھدف!

پٹھان کوٹ، جودھ پور!
مٹ گیا ہر اک غرور!

قوم ، ملک ،سلطنت، تاج، تخت، مملکت
تیرے دم سے لازوال شاد باد! مظفر جمال
'پرچمِ ستارہ و ھلال'
کا رزارِ زندگی! سیالکوٹ!
راز دارِ زندگی! سیالکوٹ!
اے بہارِزندگی! سیالکوٹ!

جلوہ گاہِ مومنین شاد باد!
تیری خاک پُر گہر! تیری خشت خشت پر
سایہء خدائے ذوالجلال!

'' حریت ''
'' جاگ رہا ہے پاکستان '' (کراچی ۱۹۶۵ء)

☆

زمیں پر آسماں کے چاند تاروں کو اُتارا ہے
ہزاروں بار خود ہم نے تمہیں آکر سنوارا ہے

مجھے کیا غم ہے، کیوں غم ہے؟ یہ سمجھا تو نہیں سکتا
سمجھنے کے لئے لیکن یہی کافی اشارا ہے

یہی میں نے بھی سمجھا تھا کہ شبنم ہے کفِ گل پر
مگر اب سوچنا پڑتا ہے شبنم یا شرارا ہے!

(کوئٹہ ۱۹۵۶ء)

سانیٹ

SONNETS

نکہت و نور کی پروردہ یہ متوالی شام
جنبشِ موجِ صبا، جیسے لچکتی کونپل
ذرے ذرے کو بناتی ہوئی اک تاج محل
گوشے گوشے میں لنڈھاتی ہوئی جامِ گُلفام
آج ہر گام پہ کرتی ہے مجھے جُھک کے سلام
آج ہر چیز نظر آتی ہے کھاتی ہوئی بَل
میری سینے میں قیامت کی مچی ہے ہلچل
بدلا بدلا سا نظر آتا ہے عالم کا نظام

جیسے ہر چیز مجھے دیکھ کے ہنس دیتی ہے
انجمستان سے کوئی جھانک کے رہ جاتا ہے
جُھک کے کہسار سے کچھ کان میں کہہ جاتا ہے
جنبشِ موجِ صبا جسم کو ڈس لیتی ہے

دل پہ گمنام سا اِک بوجھ ہے گھبراتا ہوں!
آج میں اپنے تبسم سے ہی گھبراتا ہوں!

(کوئٹہ ۱۹۴۸ء)

ہلالِ عید کو میرا سلام کہیے گا!
مرا سلام جو ہے پھول سے بھی نازک تر
مچل رہا ہے جو میرے لبوں پہ آ کر
مری جناب!مرا وہ پیام کہیے گا!
نظر جھکا کے بہ صد احترام کہیے گا!
یہ پوچھیے گا تجھے دیکھ کر کسی کی نظر
چھلک چھلک کے لٹاتی ہے آج کیوں گوہر؟
دُکھی دُکھی سی ہے کیوں،اس کی شام؟ کہیے گا!

ہلالِ عید اگر آپ کو جواب نہ دے
تو دیکھیئے کہ خُدارا یہ راز فاش نہ ہو!
یہ آپ کا ہی تبسم سہی،صدا جھلکے!
خُدا کرے یہ مرے دل کی کوئی قاش نہ ہو!
زمانہ، آپ کا عکسِ جمالِ رُخ سمجھے!
ہلال میری امیدوں کی ایک لاش نہ ہو!

(کوئٹہ۱۹۴۹ء)

کلی کا روپ گلوں کا نکھار لائی ہو
شفق سے رنگ، گھٹا سے چُرا کے حُسنِ خرام
ہر ایک گام پہ چھلکا رہی ہو ناز کے جام
قدم قدم پہ ہجومِ خمار لائی ہو
کہاں کہاں سے یہ سولہ سنگار لائی ہو
تمہارا سحر جنوں خیز بھی ہے سحر تمام
نظر نظر ہے سکونِ حیات کا پیغام
دیارِ شوق میں جوشِ بہار لائی ہو

مری نگار! مگر یہ دیارِ شوق ابھی
بہارِ زیست کی رعنائی سے ہے بے گانہ
ابھی تو گرم بگولوں کا رقص ہے جاری
تمہیں بتاؤ، میں کیسے اُٹھالوں پیمانہ

جو ہو سکے تو، لبوں کی نچوڑ دو سُرخی
لکھوں گا اس سے غمِ آرزو کا فسانہ

'' ادبِ لطیف ''　　　　(کوئٹہ ۱۹۴۹ء)

مثالِ شمع محفل ہر طرف تم ضوفشاں ہوگے
ہمکتے ہو گے تم رہ رہ کے یوں آغوشِ مادر میں
ہو،موتی جیسے اک بحرِ عرب کی موجِ مضطر میں
تم اپنی کوششِ گفتار میں کچھ نغمہ خواں ہوگے
نہیں تو چین سے خوابیدہ مثلِ گلستاں ہو گے
مگر شوکی وہ اک غنچہ جو تھا شاخِ صنوبر میں
وہی آنگن میں اک جانب،تمہارے اپنے اس گھر میں
اِس غنچہ نے پوچھا ہے کہ تم کب تک جواں ہوگے

جواں ہو کر تم اپنے ہاتھ میں کب لو گے دل میرا
مرے دل کو تم اپنے ہاتھ سے کب تک کھلاؤ گے؟
ملادوگے مری نکہت میں تم کب تک نفس اپنا
نفس سے اپنے تم سارے گلستاں کو بساؤ گے؟
یہ نیلا آسماں تکنے لگا ہے راستہ کس کا؟
تم اپنے راستے پر آسماں کو کب جُھکاؤ گے!

(کوئٹہ۱۹۵۱ء)

اُفق پر آج پھر جھلکی ہے یزداں کی جبیں ساقی
سمٹ آیا ہے آنکھوں میں،فروغِ جلوۂ ایمن
اُٹھا مینا سبو بھر دے، بڑھا دے دل کی پھر دھڑکن
مگر پہلے بتا دے ستم ہے یا ہے انگبیں ساقی!
اگر یہ انگبیں ہے تو نہیں ساقی! نہیں ساقی!
کہ انجامِ تمنا سے یہ نکتہ ہو گیا روشن
محافِظ ہے تمنا کا جنوں، ہے یہ خرد رہ زن
خرد کا آ گیا ہے آج روزِ آخریں ساقی!

خُدا حافظ کہ ہے میرا خرد خود مجھ سے شرمندہ
نہیں تو اس مئے رنگیں میں ایسی کون سی شئے تھی؟
اگر یہ معصیت ہے تو،تری رحمت ہے پائندہ
ہے تجھ سے آج لیکن التجا یہ آخری اپنی
غزالہ پوچھنے آئے تو کہنا ہاں! وہ زندہ ہے
خدا پوچھے تو کہہ دینا ضحیٰ نے خودکشی کر لی!

(کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

دریچے بند کردو، ریشمی پردوں کو پھیلا دو!
بجھا دو قمقمے، اِن قمقموں میں اب دھرا کیا ہے!
کہ اِن سے بڑھ کے روشن خانہ دل کا اندھیرا ہے
اندھیرے میں ذرا ساغر کو ساغر سے ٹکرادو
چھلکتے ساغروں سے پھر دہکتے پھول برسادو
مگر ٹھہرو، مرے سینے میں اک دھڑکن سی پیدا ہے
ذرا دیکھو تو مجھ کو ڈھونڈھنے یہ کون آیا ہے؟
اگر ممکن ہو اے رندو! تو جاؤ اس کو سمجھا دو

کہ پھولوں کے اسی روندے ہوئے انبار کے تہہ میں
ضحیٰ کی داستانِ آرزو کا اک شرارا ہے!
سبو کی گود میں، موجِ مئے گلنار کی تہہ میں
ضحیٰ کی حسرتِ دل کے سفینے کا کنارا ہے!
ضحیٰ کی فکر میں، فن کے نئے شہکار کی تہہ میں
تمہارا غم نہیں اک دوسرا غم آشکارا ہے

"ادبِ لطیف" (کوئٹہ ۱۹۵۳ء)

پچھلے برس بھی تو نے اسی ریگ زار میں
دنیائے حسن و کیف و نشاط سے رہ کے دور
بخشا تھا اس فضائے کہستاں کو رنگ و نور
چھیڑا تھا اک ادا سے مرے اس دیار میں
سازِ فسونِ جزبہ تزئیں کائینات
پھر تو کھلا ہے، پھول بنا ہے مرا یہ بن
پھر جامہ بہار کیا، تو نے زیب تن
اب کے برس بھی تجھ سے خزاں کہا گئی ہے مات!

یہ نغمہ نمو جو تری آب و گِل میں ہے
ہر پنکھڑی میں رنگ کی صورت رواں رواں
توقیرِ زندگی کے لئے جہدِ جاوداں
اے غنچہ بہار!وہ میرے بھی دل میں ہے
مٹ مٹ کے نقش تیرا اُبھرتا ہے سال سال
تیرا یہی جمال ہے، میرا یہی جمال

'' ادبِ لطیف '' (کراچی ۱۹۵۳ء)

وہی عارض، وہی آنکھیں، وہی گیسوئے دراز
لہلہاتا ہوا ، اُمڈتا ہوا ، معصوم بدن
شیشہء لب میں وہی ایک چھلکتا سا گداز
دائروں کا وہی نکھرا ہوا ، نورس گلشن
آج تم پہلے پہل بزم میں آتی ہو نظر
سوچتا ہوں کہ ، یہ تم ہو کہ ہے ماضی میرا؟
زخم کہنہ ہو کہ ہو ایک نیا زخمِ جگر
آج اے کاش! یہاں میں ہی نہ آیا ہوتا!

ڈوبتے دل کو یہ کمیاب سنبھالا ہی سہی
اس سنبھالے کا یہ احساں؟ نہیں رہنے دو ابھی
اجنبی تم نہ سہی،میری غزالہ ہی سہی
تم سے پھر آج یہ پیماں؟نہیں رہنے دو ابھی
یہ غمِ دل تو ازل ہی سے اِک عنواں ہے مرا
غمِ گیتی، غمِ انسان سے بھی پیماں ہے مرا

(کوئٹہ۱۹۵۳ء)

بے باک دعاؤں کا اثر لے کے چلے تھے
ہونٹوں پہ دمکتا ہوا مخمور تبسم
شیرینیِ آہنگ سے معمور تکلّم
دامانِ تمنّا میں گہر لے کے چلے تھے
ہر گام تجلّیِ قمر لے کے چلے تھے
کونین یمِ عزم کی پنہائی میں تھے گُم
کس درجہ پشیمان تھا اندھیرے کا طلاطم
اُس رات کہ ہم اپنی سحر لے کے چلے تھے

ہم تو یہی سمجھے تھے کہ گلریز ہیں جادے
ہر سانس میں منزل کے سکوں خیز نشاں ہیں
تخلیقِ سحر پر میرے پندار کے نغمے
لمحات کے آغوش میں ہم رنگِ فغاں ہیں
دو اِتنی اجازت تو میں پوچھوں یہ تمہیں سے
تم کون ہو؟ میں کون ہوں؟ ہم لوگ کہاں ہیں؟

’’ادبِ لطیف‘‘ (کوئٹہ ۱۹۵۴ء)

ظلمتوں نے پھر بچھا رکھا ہے جال
جال میں جکڑے گئے ہیں پھر نجوم
خندہ زن بادِ صبا پر ہے سموم
ہے یہی کیا آرزوؤں کا مآل؟
دیکھ لے جی بھر کے اے چشمِ خیال
یہ بگولوں کا چمن میں ہیر پھیر
نیم وا غنچوں کی لاشوں کا ڈھیر
اے خدا! میرے خدائے ذوالجلال
میں تو پابندِ سلاسل ہوں، مگر
مُہر بر لب دیکھتا کب تک رہوں
بہہ چکا ہے شہہ رگوں کا کتنا خوں
لُٹ رہا ہے اب بھی آنکھوں کا گُہر
کیا چلا جائے گا سب کچھ رائیگاں!
ختم کب ہوگی یہ پیکارِ خزاں!

(کوئٹہ ۱۹۵۴ء) ''ادبِ لطیف''

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد فسادات اور ہجرت کے المیئے کے اثرات نے جو فضا پیدا کی اُس نے ہمارے ہاں اُردو شاعری میں غـزل کے رُجحان کو عام کر دیا تھا۔ نئے پُرانے شعراء کی اکثریت اس دور میں غزل کی طرف راغب تھی ایسے میں جو شاعر نظم لکھ رہے تھے اُن میں ش۔ ضحیٰ کا نام سَلاستِ بیان اور نُدرتِ خیال کے اعتبار سے خاصا معروف رہا ہے۔ اُن کے آہنگ اور شعری لب و لہجے میں گھن گرج نہیں تھی۔ وہ ٹھنڈے مزاج کے انسان تھے۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں بھی دھیما پن محسوس ہوگا۔ اُن کے موضوعات کے تنوع، فطرت کے حُسن اور وطن سے محبّت کے جذبے کی فراوانی نے عجب تاثیر اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔

ماہنامہ افکار کے وہ دیرینہ رفیق اور میرے محبّی تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ اُن کے لائق فرزند عزیزی ثروت ضحیٰ نے اپنے والد کے بکھرے ہوئے کلام کو جمع کر کے کتابی صُورت میں محفوظ کر دیا ہے۔ اللہ اُنہیں خوش رکھے۔

صہبا لکھنوی
مدیر ماہنامہ افکار کراچی

نصرت پبلیکیشنز کی دیگر مطبوعات:

- ارمانوں کے کوچے میں (شعری مجموعہ) ثروت ضحیٰ
- ...فسانہ بنا دیا (افسانے) ثروت ضحیٰ

رابطہ:
اے۔ ۲/۲۷/۱۔ بلاک ۴
گلشنِ اقبال۔ کراچی۔ فون: ۱۹۵ - ۴۶۶

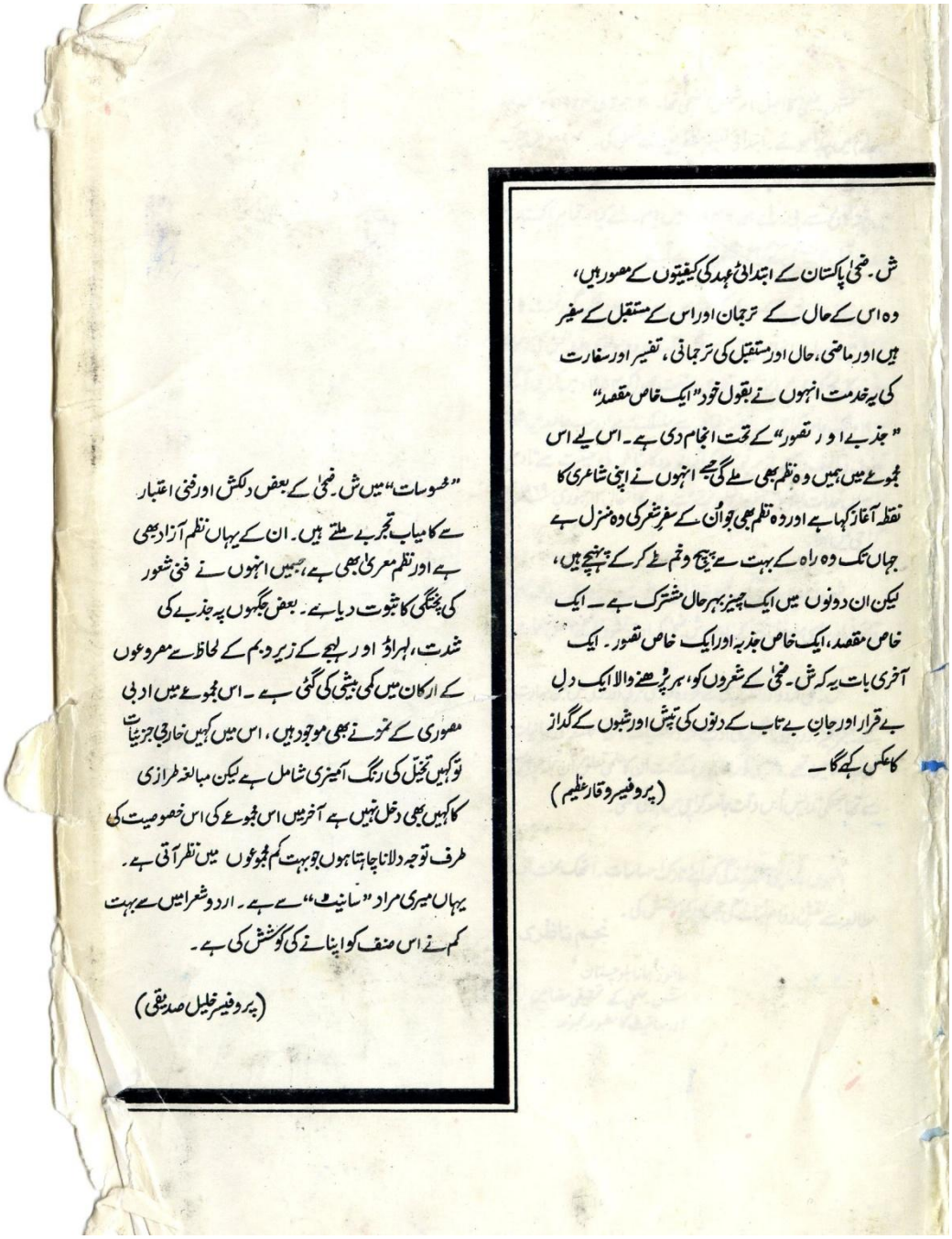

ش۔ ضحیٰ پاکستان کے ابتدائی عہد کی کیفیتوں کے مصور ہیں، وہ اس کے حال کے ترجمان اور اس کے مستقبل کے سفیر ہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کی ترجمانی، تفسیر اور سفارت کی یہ خدمت انہوں نے بقول خود "ایک خاص مقصد" "جذبے اور تصور" کے تحت انجام دی ہے۔ اس لیے اس مجموعے میں ہمیں وہ نظم بھی ملے گی جسے انہوں نے اپنی شاعری کا نقطہ آغاز کہا ہے اور وہ نظم بھی جو اُن کے سفرِ شعر کی وہ منزل ہے جہاں تک وہ راہ کے بہت سے پیچ و خم طے کر کے پہنچے ہیں، لیکن ان دونوں میں ایک چیز بہر حال مشترک ہے۔ ایک خاص مقصد، ایک خاص جذبہ اور ایک خاص تصور۔ ایک آخری بات یہ کہ ش۔ ضحیٰ کے شعروں کو، ہر پڑھنے والا ایک دلِ بے قرار اور جانِ بے تاب کے دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز کا عکس کہے گا۔

(پروفیسر وقار عظیم)

"محسوسات" میں ش۔ ضحیٰ کے بعض دلکش اور فنی اعتبار سے کامیاب تجربے ملتے ہیں۔ ان کے یہاں نظم آزاد بھی ہے اور نظم معریٰ بھی ہے، جسمیں انہوں نے فنی شعور کی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ بعض جگہوں پہ جذبے کی شدت، لہراؤ اور لہجے کے زیر و بم کے لحاظ سے معروعوں کے ارکان میں کمی بیشی کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں ادبی مصوری کے نمونے بھی موجود ہیں، اس میں کہیں خارجی جزئیات تو کہیں تخیّل کی رنگ آمیزی شامل ہے لیکن مبالغہ طرازی کا کہیں بھی دخل نہیں ہے آخر میں اس مجموعے کی اس خصوصیت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو بہت کم مجموعوں میں نظر آتی ہے۔ یہاں میری مراد "سانیٹ" سے ہے۔ اردو شعرا میں سے بہت کم نے اس صنف کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

(پروفیسر خلیل صدیقی)